سیرۃ النبی ﷺ

جلد پنجم

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتابِ مستطاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جلد پنجم

یعنی

سوانحِ اقدس حضرت سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مشتمل بر منصبِ نبوت حصہ عبادات

جس میں پہلے عبادات کا مفہوم بتایا گیا ہے، پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر وغیرہ، بدنی ومالی وقلبی عبادات کی تشریح اور ان کے احکام ومصالح کی توضیع کی گئی ہے۔

تالیف

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء

دار المصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ یو-پی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلۂ دار المصنفین نمبر ۱۴۴

کتاب	:	سیرۃ النبی ﷺ حصہ پنجم
مصنف	:	مولانا سید سلیمان ندویؒ
صفحات	:	۳۵۶
ایڈیشن	:	۲۰۱۹ء
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)
ناشر	:	دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)
قیمت	:	
باہتمام	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی

ISBN: 978-93-80104-71-3
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

سیرۃ النبی ﷺ حصہ پنجم

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ النبی ﷺ کی یہ پانچویں جلد رجب ۱۳۵۴ھ ہجری میں بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظرِ ثانی کے لئے مجھے وقت نہیں ملتا تھا، اس لئے یہ کام جلد از جلد انجام نہ پا سکا، اب جب اس سے فرصت ملی اور بعض دوستوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا، تو تین برس میں یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگذاشتیں جو طبع اول میں ہوگئی تھیں، ان کی اصلاح کر دی گئی ہے پھر بھی عصمت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری لغزشوں سے درگذر فرمائے اور میری لغزشوں کو دوسروں کی لغزشوں کا سبب نہ بنائے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

داعی

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین، اعظم گڑھ

۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

دیباچہ

سیرۃ النبی ﷺ کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ ہجری میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گنہ گار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسنِ قبول کے لئے کھول دیا ہے۔

موضوع: اس جلد کا موضوع عبادت ہے۔ اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام وانواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت وحکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذات پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطاکار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستے سے نہ ہٹے جو صراطِ مستقیم ہے اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے، تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ ”جو بات کہی گئی ہے، اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو نفسِ خطاکار کا قصور ہے۔“

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق: ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیر کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو تھا، ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:-

''چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت میں آجائیں یعنی تمام مسائل مہمات پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا، گو لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔'' (مکاتیب شبلی ج ا بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نمبر ۱۰۴ ص ۲۰۲ طبع چہارم ۱۹۶۶ء)

سیرت جلد اول کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان منصبِ نبوت رکھا تھا اور لکھا تھا:

''دوسرا حصہ منصبِ نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیمِ عقائد، اوامر و نواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصبِ نبوت کے کاموں کی تفصیل، اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد و اخلاق اور عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیوں کر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔ (جلد اول طبع اول ص ۴۷، طبع دوم ص ۹۷ و طبع جدید کمپیوٹر ایڈیشن ص ۶۶)

گذشتہ چوتھی جلد، یہ پانچویں جلد اور آئندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصبِ نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں۔ منصبِ نبوت، عرب کی گذشتہ حالت اور تعلیمِ عقائد، چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائضِ خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہے، اخلاق و معاشرت کے نکتوں کے لئے چھٹی جلد اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں، ساتویں جلد ہوگی۔ ان میں سے

ہر موضوع کی تفصیل وتشریح میں مصنفِ اول کی ایماء کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے۔ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے،ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیوں کر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے:

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد "مرا" گفت ہماں می گویم

حسنِ قبول: اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسنِ قبول کی سند عطا فرمائی:

ع قبول خاطرِ دلہا خداداد ست می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا،"یہ کتاب وہاں قبول ہوگئی"۔ان کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی، علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے، ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا، فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظرِ طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابلِ توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں نئے دعووں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ کر لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد اللہ پیدا ہوگیا ہے اور اس کی تعلیم ومطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہوگیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد: اس کتاب کے حسنِ قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جوں ہی شائع کیا اس کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر تارِ نفس محبتِ رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ تھا، یعنی ملتِ محمدی کی خادمہ اور امتِ محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرماں روائے کشورِ بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید

یہ توجہِ ہمایونی باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا، جو مر چکا، بلکہ اس خدا کے لئے تھا، جس کو موت نہیں، اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی، مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہ ہر صورت ۔۔۔ کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے

رہا تالیف وتنقیدِ روایت ہائے تاریخی ۔۔۔ تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جن میں اک فقیرِ بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے

جب اس ''فقیرِ بے نوا'' کی وفات ہوئی تو سرکارِ عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ ''فقیرِ بے نوا تو چل بسا اب سلطان کی باری ہے'' آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف وتنقید روایت کے ساتھ ساتھ ''زرافشانی کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج وتخت ایک ایسے جواں بخت کے سپرد کر گئیں، جس نے فرائضِ حکومت کی گراں باری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھا لیا اور سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خاں بہادر فرماں روائے بھوپال کی عمر ودولت واقبال میں اللہ تبارک وتعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیرِ سایہ امت وملت کی سیکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں۔ خلد اللہ ملکہ۔

۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۶ھ ہجری میں سیرت کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع مظفر الملک والمما لک ونظام الدولہ نظام الملک سلطانِ دکن خلد اللہ ملکہ کی پیش گاہِ خسروی میں پیش کیا، حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ وآقا حضرت سرورِ کائنات فخرِ موجودات سید المرسلین محبوب رب العالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ الوف التحیات والصلوۃ کی ذاتِ قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے، سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور ومحظوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا، بے حد مدد ملی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا

فرمائے، عمر کا رہوارِ زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے اور آخر میں خوش قسمت سعدیؔ کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے:

منزل تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گڑھ ۲۳؍رجب ۱۳۵۴ھ؍ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عملِ صالح

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر ۱۰۳:۳)

محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم کو لے کر آئے، اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات وفلاح دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک ایمان اور دوسری عملِ صالح، کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح وتوضیح میں تھی، اب یہ پیش نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح وبیان میں ہے، ایمان بنیادی اصولوں پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے اور عملِ صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم ویقین کامیابی کے لئے کافی نہیں، جب تک اس علم ویقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں یعنی ایمان وعملِ صالح پر مبنی قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عملِ صالح کو نہیں، حالاں کہ یہ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عملِ صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہوسکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے، ایمان کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کی ہے، جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے لیکن اگر صرف اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کو تسلیم کرلیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فنِ تعمیر وہندسہ اور مساحت وپیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کارآمد نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے انسان کو

وہ فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے، قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثنا ایمان اور عملِ صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عملِ صالح کو دوسری حیثیت دی ہے، فرمایا:

وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر:۱۰۳-۱تا۳)

زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عادل ہے کہ ان ہی افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں، جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت میں فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ. ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ. (والتین:۹۵-۴تا۶)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا، پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا، لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عملِ صالح کی بلندی ہے، یہود سے جن کو دعویٰ تھا کہ بہشت ان ہی کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (بقرہ:۲-۸۲)

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح پر ہے جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے، فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (مائدہ:۵-۶۹)

کام کرلے، نہ تو ان پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح ونجات کا حصول کسی نسل وقومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب وملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین ودنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا. وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰى (کہف:۱۸-۸۷،۸۸)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائے گا تو وہ اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اس کے لئے بدلہ کے طور پر بھلائی ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ. (انبیاء:۲۱-۹۴)

تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل) لکھتے جاتے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا. اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا. (مریم:۱۹-۵۹،۶۰)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی، تو وہ گمراہی سے ملیں گے لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کئے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل ان ہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ. ذٰلِكَ الَّذِىْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (شوریٰ:۴۲-۲۲،۲۳)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں، یہی بڑی مہربانی ہے، یہی وہ ہے جس کی خوش خبری اللہ اپنے بندوں کو دیتا ہے، جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۔ (کہف: ۱۸-۱۰۷)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کی مہمانی کے لئے باغ فردوس ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۔ (کہف: ۱۸-۱۱۰)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے، اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کرسکتا ہے، لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات وفلاح کا ذریعہ بتایا ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۔ (حج: ۲۲-۵۶)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۵ موقعوں پر یہ آیت ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم وملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، اور نجات اور فوز وفلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے، البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔

جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت وسلطنت کا وعدہ فرمایا ہے، وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی ہو:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (نور: ۲۴-۵۵)

تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی ان ہی سے تھا:

وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا . (فتح:۴۸-۲۹)	اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، بخشایش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

بعض آیتوں میں ایمان کے بہ جائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عملِ صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگہ دی گئی ہے، مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا:

بَلٰی مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ . (بقرہ:۲-۱۱۲)	کیوں نہیں، جس نے اپنے کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکوکار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے، اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے، جس سے اسلام سے پیش تر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی، عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط میں ہے (۱)۔ صرف ایمان پر نجات کا دارومدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسانیت کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عملِ صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار ان ہی دو باتوں پر ہے، کوئی مریض صرف اصولِ طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے، اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں، جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ. الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ . وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ . وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوۡنَ. وَالَّذِیۡنَ هُمۡ	وہ ایمان والے مراد کو پہنچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو نکمی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ......

(۱) رومیوں کے نام ۳ و ۴ الکتاب المقدس کتاب العہد الجدید ص ۳۴۹ و ۳۵۰۔

لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ. ....وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ.

..........اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھتے ہیں، جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں۔

(مومنون: ۲۳-۱تا۵و۸تا۱۰)

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل واسباب کے تابع فرمایا ہے، یہاں کی کامیابی اور فوز وفلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے، ہماری بھوک دفع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لئے ہم کو جدو جہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ سکتے، جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں، یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے، اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان، کامیابی کے حصول کے لئے بے کار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیوں کہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آجانے اور نیک بن جانے کی امید ہو سکتی ہے اور دوسرے کے لئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے، اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمالِ صالحہ کی قسمیں: ”عملِ صالح“ کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں، عبادات، اخلاق، معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے، جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو، اس لئے اخلاق ومعاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائیں تو وہ عبادت میں داخل ہیں، مگر فقہا نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں، جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے، اس کو عبادت کہتے ہیں دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ

ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمالِ صالحہ کی ان ہی تینوں قسموں کی تفصیل وتشریح سیرۃ النبی ﷺ کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (بقرہ-۲:۲۱)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے، لیکن یہ عبادت کا نہایت تنگ مفہوم ہے، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی، اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

اہلِ عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے، وہاں عبادت کے مفہوم ومعنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے، عرب میں جو یہودی اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش وآرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں، ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی وکوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک ''راہبِ متبتل'' کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرء القیس کہتا ہے:

منارۃ ممسی راہب متبتل (۱)
دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا شام کا چراغ۔

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے، ان میں

(۱) دیوان امرء القیس ص ۷ ادار المعارف قاہرہ۔

روحانی خلوص وایثار اور خداپرستی نام کو نہ تھی، وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے، قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیوں پر اس نے بے حکمی، نافرمانی، اکلِ حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔(۱)

یہودی جادوٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے، اور جب کبھی موقع ملتا، غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیا اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے، انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے اور ان کا نام انہوں نے دین داری رکھا تھا، سورہ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاری کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں، اسی لئے قرآن پاک نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ. ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ. (حدید: ۵۷-۲۶و۲۷)	اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں، پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰؑ کی پیروی کی، ان کے دل میں نرمی اور رحم دلی بنائی، اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی، لیکن خدا کی خوش نودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا چاہا تھا، نہیں نباہا تو ان میں جو ایمان دار تھے، ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین محمدی ﷺ میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے،

(۱) دیکھو سورہ مائدہ ۵:۶۲ و ۷۷ اور سورہ حدید ۵۷:۱۶ و ۲۷۔

اسی لئے قرآن نے ان کو بار بار کہا:

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (نساء:۴-۱۷۱ و مائدہ:۵-۷۷) — اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا، وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ان کو قتل کرتے تھے، وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ (بقرہ:۲-۶۱ و آل عمران:۳-۲۱) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہم سایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ توراۃ میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے:

وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ (مائدہ:۵-۶۰) — اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو تبلیغ کی:

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ. قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ

(مائدہ:۵-۷۵تا۷۷)

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس، اس سے پہلے اور پیغمبر گذر چکے اور اس کی ماں ولی تھی، دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لئے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں، پھر بھی دیکھ وہ کدھر الٹے جاتے ہیں، (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے، (جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے) آپ ﷺ فرمایئے کہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو پہلے بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے۔

ان کی حالت یہ تھی:

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ:۹-۳۱) — خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا۔

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں

تھیں ، ان میں حضرت عیسیٰؑ ، حضرت مریمؑ اور حواریوں ، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے ، عبادت گذار ان کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سر بہ سجود رہتے تھے ، صحابہؓ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ، ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی ، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواجِ مطہرات نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا ، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ، خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے ، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا ، تم ایسا نہ کرنا ، ان میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا ، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنالیتے تھے ، اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کردیتے تھے (۱)

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی وزوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہیں ، وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں ، خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ ، حضرت مریمؑ ، سینٹ پال ، اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے ، وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے درودیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں اور آج بھی دین دار عیسائی دن رات موی بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں ، روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ، اور اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام کی ایک ہستی سے واقف ضرور تھے ، مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے ، لات ، عزیٰ ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے ، ان پر جانور کی قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے ، سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے ، خانہ کعبہ یعنی خلیلِ بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہوکر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں ، قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت ﷺ

(۱) صحیح مسلم کتاب المساجد باب النھی عن بناء المساجد علی القبور ج ۱ ص ۲۰۰۔

کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ ''اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں، اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا''۔(۱)

ایک صحابی شاعر عامرؓ بن اکوع خیبر کے سفر میں یہ ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت ﷺ سن رہے تھے(۲)

واللہ لولا انت ما اھتدینا	ولا تصدقنا ولا صلینا
خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو ہم نہ راستہ پاتے	نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ہی کی تعلیم تھی، جس نے اہلِ عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں، ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے، روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جارہی تھیں، زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں، سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین کے کنفوشس اپنے باپ، دادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابیِ سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے، باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی، غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی، ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی:

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ:۲-۲۱)	لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔

سابق کتبِ الٰہی کے امانت داروں کو آواز دی گئی:

---

(۱) سیرت ابن ہشام ج ۱ص ۱۴۴ ذکرِ ورقہ .... وزید بن عمرو۔ (۲) صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب غزوۃ خیبر ج ۲ ص ۹۶ و ۹۷ شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے۔

يَـآ اَهْـلَ الْـكِتٰـبِ تَـعَـالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ (آل عمران:۳-۶۴)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں، جس میں ہم تم عقیدتاً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکار اٹھے:

رَبَّنَـآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا (آل عمران:۳-۱۹۳)

خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار، ہمارے گناہ معاف کر۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان میں آپ کی زبانِ عبودیت ترجمان سے بارگاہِ الٰہی میں کی گئی تھی:

''خداوندا! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے لڑنے پر آمادہ ہے، خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی''(۱)

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی اور قبول فرمائی، کیوں کہ خاتم الانبیا کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت: مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوتِ محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا، باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کردی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ:

اِنْ كُـلُّ مَـنْ فِـى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا. (مریم:۱۹-۹۳)

آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں، نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع وقیام کی مستحق ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جان دار کا خون بہایا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی

(۱) صحیح مسلم کتاب الجهاد باب الامداد بالملائکة فی غزوة بدر ج ۲ ص ۴۷۔ وجامع ترمذی کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ انفال، ج ۲ ص ۱۳۹ و مسند احمد ج ا صفحات ۳۰ و ۳۲ و ۱۱۷۔

ہے، اور نہ اس سے دعا مانگی جاسکتی ہے، ہر عبادت صرف اسی کے لئے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. (انعام:۶-۱۶۳)

بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں، لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا:

قُلْ یَااَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ. لَآاَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ. وَلَآاَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. وَلَآاَنَا عَابِدٌمَّاعَبَدْتُّمْ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ. (کافرون:۱۰۹-۱تا۶)

اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو، اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کو پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا، اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں، تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین ہے۔

خارجی رسوم کا وجود نہیں: خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب (۱) نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت (۲) نہ دیوتاؤں، دیبیوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت (۳) نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم (۴) نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید (۵)، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں: اسلام میں عبادت کے لئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کے دین

---

(۱) جیسا کہ ہندوؤں میں ہے۔ (۲) جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔ (۳) جیسا کہ ہندوؤں، عام بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں ہے۔ (۴) جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے۔ (۵) یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں، پارسیوں میں سپید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں، نہ حاخام ہیں، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لئے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے، اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرضِ حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو میں جواب دوں گا:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مومن: ۴۰-۶۰) تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

خارجی کشش کوئی چیز نہیں: اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دل کش، دل فریب، مؤثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہیں ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بربط کی دل کش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور لیکن دین محمدی کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص واثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں: ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے، بت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں، اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں، من جملہ ان کے ایک یہ ہے:

وجعلت لی الارض مسجدا (۱) اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔

تم سوار ہو کہ پیادہ، گل گشتِ چمن میں ہو کہ ہنگامۂ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز

---

(۱) بخاری کتاب الصلاۃ باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض مسجدا وطہورا ج ۱ ص ۶۲۔

بجالا سکتے ہو، یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو، جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو۔(۱)

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لئے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے، لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کے حدود سے پاک ہے، وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہہ کا قائل نہیں، دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں، مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی، جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانۂ کعبہ کے صحن میں بہ یک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے، اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے، تو جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی خدا ہے، چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں عام نفل نمازوں کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں، جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے، لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جا سکتی ہے، اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے، تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے، کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت: بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر یا دریا میں ڈبا کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے، اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروانہ کی جائے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا، اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔(۲)

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الصلاۃ باب الصلاۃ فی البیعۃ ج۱ص۶۲۔(۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ ج۲ص۹۰۱۔

حیوانی قربانی میں اصلاح: کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا، عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے، کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے، اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اہل عرب یہ سمجھتے تھے خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے، ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی، ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے (۱)۔ بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے، پیغامِ محمدی ﷺ نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا، اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں بلکہ تمہارے دل کی غذا مطلوب ہے، فرمایا:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج:۲۲-۳۷)

اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لئے جو موقعِ حج پر نہ گئے ہوں، مقامِ حج کی یاد کے لئے قربانی مسنون کی گئی ہے، تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیامِ محمدی ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، جان کا فدیہ دینا، یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصد دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے، چنانچہ فرمایا:

---

(۱) احبار ۲۱-۶۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ.

(حج:۲۲-۳۴)

ہم نے ہر قوم کے لئے قربانی مقرر کی تا کہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں، جو ہم نے ان کو روزی کی، تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ، اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوش خبری سنا دے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ.

(حج:۲۲-۳۶)

اور قربانی کے جانوروں کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے، تمہارے لئے ان میں بہت فائدے ہیں، ان کو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے بل گریں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند محتاجوں اور فقیروں کو کھلا دو، اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے، وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ (......) عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ ﷺ سے پوچھا، آپ ﷺ نے فرمایا، خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ۔(۱) غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں، صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں کی دیبیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت: اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں، عرب میں جانوروں کی قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا، بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے، اور اس کی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے، رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی، جس کا نام عتیرہ تھا، اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا، اور رجب کی تخصیص باطل کر دی:

قال لا فرع ولا عتیرة (۲) آپ ﷺ نے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔

---

(۱) ابوداؤد کتاب الضحایا باب فی العتیرة جلد دوم ص ۳۵ مطبع قادری دہلی۔ (۲) ایضاً۔

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اوران کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ م بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ:۵-۱۰۳) — نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا۔

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے، لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلے میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا:

لا عقر فی الاسلام (۱) — اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا، پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا، اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا۔ (۲)

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہیں: عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے، اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے، اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے، اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی، چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد اور ترکِ دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا، لیکن نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راز آشکارا کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترکِ لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غم گینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی

(۱) ابوداؤد کتاب الجنائز باب کراھیۃ الذبح عند القبر جلد۲ ص۱۰۳ (۲) ابو داؤد کتاب الاضاحی باب ماجاء فی اکل معاقرۃ الاعراب جلد۲ ص۳۳۔

اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے، خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے، اس نے کہا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ:۲-۲۸۶)

خدا تمہارے ساتھ آسانی کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں، اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ:۲-۱۸۵)

خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں۔

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرمادیا:

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران:۳-۹۷)

(جس کو زاد راہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج: ۲۲-۷۸)

اور تمہارے لئے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان ھذا الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبه(۱)

یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کردے گا۔

اور فرمایا:

انما انا بعثت بالملة السمحة او السهلة الحنيفية البيضآء(۲)

میں سہل اور آسان، روشن، حنفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دینِ حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا:

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (حدید:۵۷-۲۷)

اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا، تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔

---

(۱) جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول ص ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی (۲) مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶ (الفاظ کسی قدر مختلف ہیں "ض")۔

ان لوگوں سے جنھوں نے اچھے کھانوں اور زیب وزینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لئے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف:۷-۳۲)

پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب وزینت اوررزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے بنایا، کس نے حرام کیا؟

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بعض بیبیوں کی خوش نودیٔ مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا، خدا نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (تحریم:۶۶-۱)

اے پیغمبر خدا نے جس چیز کو تیرے لئے حلال کیا تو اس کو اپنی بیبیوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

صحابہؓ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلانِ طبع کے سبب سے تجرد، ترکِ لذائذ اور ریاضاتِ شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا، قدامہؓ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کی ''یارسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ''میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں'' یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو ایک نہایت عابد وزاہد صحابی تھے، یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے'' (۲) اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دوسرے تقشّف پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کو فرمائی، آپ ﷺ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب وروز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں، آپ ﷺ نے ان کو بلا کر پوچھا، کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے'' عرض کی ''خدا کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ﷺ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں'' فرمایا ''میں سوتا بھی ہوں اور نماز

(۱) صحیح بخاری کتاب النکاح باب ترغیب النکاح ج ۲ص ۷۵۷ (۲) ایضاً کتاب الصوم باب حق الجسم فی الصوم ج ۱ص ۲۶۵۔

بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی''۔(۱)

قبیلہ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انھوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ﷺ ان کو پہچان نہ سکے، انھوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا ''تم خوش رو تھے، تمہاری صورت کیوں ایسی ہوگئی'' عرض کی ''یارسول اللہ ﷺ جب سے آپ ﷺ سے مل کر گیا ہوں، متصل روزے رکھتا ہوں'' فرمایا ''تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے'' انھوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی، تو آپ ﷺ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی، انھوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے مہینے میں تین روزے کردئے، انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے ماہِ حرام کے روزوں کی اجازت دی (۲) ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواجِ مطہراتؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ ﷺ کی دن رات کی عبادت وریاضت کا حال دریافت کیا وہ سمجھتے تھے کہ رسول ﷺ خدا کو دن رات سوائے عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھوں نے آپ ﷺ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ ﷺ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا، کبھی نکاح نہ کروں گا، آنحضرت ﷺ ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے، ان کو خطاب کرکے فرمایا ''خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم میں روزہ رکھتا اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقے پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں''۔(۳)

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کرسکتے تھے اور ضبطِ نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادیں، انھوں نے آنحضرت ﷺ سے اس رہبانیت کی اجازت

---

(۱) ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب یومربه من القصد فی الصلوۃ ج۱ص۱۹۳ (۲) ابوداؤد کتاب الصیام باب صوم اشهر الحرام ج۲ص۳۲۹ (۳) صحیح بخاری کتاب النکاح باب الترغیب فی النکاح ج۲ص۷۵۷۔

چاہی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے۔(۱)

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس اہتمامِ بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم ومقصود تعلیم فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں، اس لئے انھوں نے افطار نہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دن روزے رکھے تھے، کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے افطار کرلیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں، فرمایا تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے(۲)، اسی لئے اسلام میں عام امت کے لئے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھمبے میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت فرمایا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے، رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی جاتی ہیں تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے، جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔(۳)

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ''یہ خولاء ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے'' فرمایا کہ ''یہ رات بھر نہیں سوتی'' لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔(۴)

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے تھے، ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب النکاح باب ما یکرہ من التبتل والخصاء و ابوداؤد کتاب النکاح (۲) صحیح مسلم کتاب الصیام باب النهي عن الوصال فی الصوم ج ۱ ص ۴۰۹ (۳) جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر واوسط للطبرانی و ابوداؤد عن انس جلد اول ص ۲۰ طبع میرٹھ باب الاقتصاد فی الاعمال (۴) جمع الفوائد بحوالہ صحیحین وموطا ونسائی۔

اکلفوا من العمل ما تطیقون فان اللہ لا یمل حتی تملوا فان احبَّ العمل الی اللہ ادومہ وان قل (۱)	اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو، کیوں کہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں، بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے، یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے، یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے، بعض لوگ اپنی گنہ گاری کے اظہار کے لئے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں، حضرت عقبہؓ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی، عقبہؓ نے آکر آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا، آپ ﷺ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں، ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں (۲) اسی طرح آپ ﷺ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپ ﷺ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا، اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا میں جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے، لیکن تم اس پر سوار ہو لو (۳) ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ ﷺ نے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود چل نہیں سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے، فرمایا "خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو۔ (۴)

ایک دفعہ آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے، آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے،

(۱) ابوداؤد باب القصد فی الصلوۃ ج ۱ ص ۱۹۳ (۲) ابوداؤد کتاب الایمان والنذور باب من رای علیہ کفارۃ الخ ج ۲ ص ۱۱۱ و مسند ابن جارود کتاب الایمان والنذور (۳) صحیح بخاری کتاب المناسک باب رکوب البدن ج ۱ ص ۲۲۹ (۴) ابوداؤد کتاب الایمان والنذور باب من رای کفارۃ الخ ج ۲ ص ۱۱۲ و ترمذی ابواب الایمان والنذور باب فیمن یحلف بالمشی ولا یستطیع ج ۱ ص ۲۸۱ و نسائی و ابن جارود کتاب الایمان والنذور۔

سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے"۔(۱)

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپ ﷺ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔"(۲)

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپ ﷺ نے فرمایا:

لاتشدوا علی انفسکم فانما هلک من قبلکم بتشدیدهم علی انفسهم وستجدون بقایاهم فی الصوامع والدیارات (۳)	اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلے قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔

خاتم الانبیاء ﷺ نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

لاصرورةَ فی الاسلام (ابوداؤد، ج۱ص۲۴۱)	اسلام میں رہبانیت نہیں۔

عزلت نشینی اور قطعِ علائق عبادت نہیں: اکثر مذاہب نے دین داری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے، اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات وعلائق وفرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیروؤں کو جواں مرد

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان والنذور باب النذر فیما لا یملک ج۲ص۹۹۱ وابوداؤد کتاب الایمان والنذور باب النذر فی المعصیة ج۲ص۱۱۱ وابن جارود کتاب الایمان والنذور (۲) صحیح بخاری کتاب الایمان والنذور باب النذر فیمالایملک ج۲ص۹۹۱ (۳) جمع الفوائد بحواله معجم کبیر واوسط للطبرانی وابوداؤد کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب الاقتصاد فی الاعمال ج۱ص۲۰۔

سپاہی دیکھنا چاہتا ہے، جوان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترکِ فرض نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے، ترکِ عمل نہیں بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔

ابھی آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بعض ان صحابہ کو جو اہل وعیال اور دوست واحباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے، فرمایا ''اے فلاں! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے''۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجالانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گذر ایسے مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ بابرکت میں آکر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترکِ دنیا کرلوں، آپ ﷺ نے فرمایا ''میں یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔(۱)

اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ غارِ حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے، لیکن جب وحی کا پہلا پیام آپ ﷺ کے پاس آیا اور دعوت وتبلیغ کا بار آپ ﷺ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا، شب وروز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن گوشہ عزلت اور زاویۂ تنہائی میں بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرزِ عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی (۲)

---

(۱) مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۶۶ (۲) اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے، ایک اس شخص کے لئے جس میں فطرتاً بدی ہے جس کی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کرلے صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا، ایک تو وہ جو اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے، دوسرے وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب العزلة راحة من خلاط السوء ج ۲ ص ۹۶۱) اس تعلیم نبوی ﷺ نے انسانوں کی دو قسمیں کردیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام میں عبادت کا مفہوم: اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں، جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے، عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاحِ شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجالانا ہے، اسی لئے قرآنِ پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰاخِرِیْنَ. (مومن:۴۰-۶۰)

جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہوکر جائیں گے۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا:

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (انبیاء:۲۱-۱۹)

جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔

سعادت منداور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر یہ فرض ہے کہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دیں یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آجائے، ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ گناہ کے بار سے، اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔

دوسرا موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے وہ ہے جب مجمع وآبادی یا قوم وملک میں فتنہ وفساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ''ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا تاکہ وہ اپنے دین وایمان کو فتنوں سے بچاسکے (صحیح بخاری کتاب الرقاق باب العزلة من خلاط السوء ج۲ ص۹۶۱)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہے اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے جماعت کے دائرۂ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ. (سجدہ:۳۲-۱۵)

میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جن کو ان آیتوں سے سمجھایا جائے، تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور اور استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں، اس بنا پر اگر غرور اور استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفہ محمدی کی زبان میں ''عبادت'' بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی انسان بہ ظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے، لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امرِ فارق ہے، قرآن میں یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے:

وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی. الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی. وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی. اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی. وَلَسَوْفَ یَرْضٰی.

(لیل:۹۲-۱۷تا۲۱)

دوزخ سے وہ پرہیزگار بچالیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے، اس پر کسی کا احسان باقی نہیں، جس کا بدلہ اس کو دینا ہو، بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۲۷۲)

اور تم تو صرف خدا کی ذات کی طلب کے لئے خرچ کرتے ہو۔

اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (دہر:۷۶-۹)

ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہیں۔

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ. الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ. (ماعون:۱۰۷-۴تا۶)

پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوے کے لئے کام کرتے ہیں۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت ﷺ نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرمادی ہے کہ:

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی، ج۱ص۲ومسلم)

اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

اسی کی تشریح آپ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھربار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آرہے تھے:

لکل امرءٍ مانوی فمن کانت هجرته الی الله ورسوله فهجرته الی الله ومن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امراۃٍ ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه (بخاری، ج ۱ باب اول، ص۲)	ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کی ہجرت خدا کی طرف ہے، اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے یا کسی عورت کے لئے ہے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے، اس میں کسی خاص کام اور طرز وطریقہ کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ جائز کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔

تعلیمِ محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض وغایت بنا دیا ہے اور یہی ''عبادت'' سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (بقرہ:۲-۲۱)	اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تا کہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض وغایت محض حصولِ تقویٰ ہے۔

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے، آپ ﷺ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تقویٰ کی جگہ یہ ہے'' (۱) اور قرآن نے بھی ''تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج ۲۲:۳۲)'' (۲) دلوں کا تقویٰ کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے، اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال واعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، عبادت ہیں۔

---

(۱) مسلم کتاب البر والصله باب تحریم ظلم المسلم الخ ج ۲ ص ۳۸۲ (۲) حج -۲۲:۳۲۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند مخصوص اعمال کا نام ہے، جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے، مثلاً نماز، دعا، قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بے حد وسیع کر دیا، اس تعلیم کے رو سے ہر وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوش نودی کے حصول کے لئے کیا جائے، عبادت ہے، اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لئے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو، لیکن اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمایش، دکھاوا، حصولِ شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوش نودی اور رضا مندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعتاً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے، دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کئے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمایش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں، دین کے کام ہیں، اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے، آپ نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے (۱) کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا عبادت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۷۲)	اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت

(۱) صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف ج۲ص۹۰۵۔

ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا:

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود:۱۱-۱۲۳)	اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔

اسی طرح مشکلات میں صبر اور استقلال بھی عبادت ہے، فرمایا:

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ (مریم:۱۹-۶۵)	اس کی عبادت کر اور صبر کر۔

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا اور کسی گنہ گار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى (بقرہ:۲-۲۶۳)	اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔

اسی آیتِ پاک کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

کل معروف صدقة (بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقة، ج۲ص۸۹۰)	ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔
تبسمک فی وجه اخیک صدقة واماطة الاذی من ای طریق صدقة(۱)	تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے، راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے۔

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل الله وکالذی یصوم النهار ویقوم اللیل (بخاری کتاب الادب، باب الساعی علی الارملة)	بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر (نفل) روزہ اور رات بھر (نفل) نماز پڑھتا ہو۔

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نفل نماز، نفل روزہ اور صدقہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ ﷺ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا:

(۱) ترمذی ابواب البر والصلة باب ماجاء فی صنائع المعروف ج۲ص۱۷ لیکن مکمل روایت اس طرح ہے تبسمک فی وجه اخیک لک صدقة وامرک بالمعروف صدقة ونهیک عن المنکر صدقة وارشادک الرجل فی ارض الضلال لک صدقة وبصرک للرجل الردی البصر لک صدقة واما طتک الحجر والشوک والعظم لک صدقةوافراغک من دلوک فی دلو اخیک لک صدقة "ض"۔

الا اخبرکم بافضل من درجة الصیام و الصلوٰة والصدقة — کیا میں تم کو نفل روزہ نماز اور صدقہ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں۔

صحابہؓ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ ارشاد فرمائیے، فرمایا:

اصلاح ذات البین (۱) — وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ، ایک دوسرے صحابی حضرت ابو درداءؓ سے ملنے گئے، تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ ''تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے'' اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا تو ابو درداءؓ نے کہا میں روزے سے ہوں، حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا، آخر انہوں نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابو درداءؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلے پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو، چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا، اے ابو درداءؓ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو، حضرت ابو درداءؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سلمان نے سچ کہا۔'' (۲)

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ''یارسول اللہ ﷺ تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے'' فرمایا، ''خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا'' لوگوں نے پوچھا ''کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے'' ارشاد ہوا ''جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو'' انھوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا ''پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو، اس کا کام کردو'' پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے، فرمایا ''تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔'' (۳)

ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ ''میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا'' وہ عرض کریں گے ''خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہاں کا پروردگار

(۱) سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۶۷۳ (کلکتہ) (۲) صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف ج۲ ص ۹۰۶ (۳) ادب المفرد امام بخاری باب معونة الرجل اخاہ ص ۴۵ ۱۳۰۹ھ۔

ہے، فرمائے گا کیا معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا" اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے، اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا، وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں، تو تو خود تمام جہاں کا پروردگار ہے، وہ فرمائے گا تجھ کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا، اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، وہ کہے گا اے پروردگار میں کیوں کر تیری بیمار پرسی کروں تو تو خود تمام جہاں کا پروردگار ہے، فرمائے گا تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اس کے پاس پاتا۔(۱)

اس موثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور دکھادیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوش نودی کے حصول کے کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں، آپ نے انہیں بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے، اس کا تم کو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اس کا بھی ثواب ہے"(۲) ابو مسعود انصاریؓ سے ارشاد فرمایا "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے"(۳) غریب و نادار صحابہ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ "یا رسول اللہ ﷺ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں، جو ہم نہیں بجالا سکتے" فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے، جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے، لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے" فرمایا کہ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا"۔(۴)

محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسنِ عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی تو بر تو غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو

(۱) ادب المفرد باب عیادۃ المرضی ص۱۰۲ (۲) ادب المفرد باب یوجر فی کل شیئ. ص۱۵۱ (۳) صحیح بخاری کتاب النفقات باب النفقة علی الاھل ج۲ ص۸۰۵ (۴) ادب المفرد باب کل معروف صدقة ص۴۷۔

جائے گا کہ وحیِ محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقتِ انسانی کی غرض وغایت عبادت الٰہی قرار دی ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ. (ذاریات:۵۱-۵۶) اور میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیتِ پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے، جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے، جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں، جن کے بہ حسن وخوبی انجام دینے کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہ ہوا کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سیکڑوں معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں جن میں سے ہر ایک فریضۂ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوانِ باب ہے، جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں، اس لئے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں۔

۱- بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے، جس کا عنوان نماز ہے۔

۲- وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے، صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

۳- خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، روزہ ہے، یا یوں کہو کہ ایثار وقربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

۴- دنیائے اسلام میں ملتِ ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام اور اس مرکزی آبادی اور کسبِ روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرِ عنوان حج ہے۔

غور کر کے دیکھئے انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی اصولِ چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا (۱) پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں، انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں عبادتیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیاتِ باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں، جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوانِ باب ہیں، ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلوتہی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے، یہیں سے یہ شبہہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقوٰی کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی، ہمارا حج گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرن اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موجودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا یہ وعدہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط ہے، فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ	اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔

(نور:۲۴-۵۵)

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس ج۱ص۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس ج۱ص۲۶۔

اس لئے ایمانِ کامل اور اعمالِ نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیرووں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے(۱) اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

☆

(۱) سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی ﷺ ج ۱ ص ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر کلمة واحدة یعطونیها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم۔

نماز

اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ (روم: ۳۰-۳۱)

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر وغریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار وتندرست سب پر یکساں فرض ہے، یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو، اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منھ سے نہیں بول سکتے ہو تو اشاروں سے ادا کرو (۱) اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے ہو تو چلتے ہوئے پڑھو (۲) سخت خوف کی حالت میں اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف موقع ہو اسی رخ پڑھو (۳)۔

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان ورحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد وثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم وجان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق ومخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی آس ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس واثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا، اس کے حضور میں دعا وفریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے، جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (اعراف: ۷-۱۷۲) کا فطری جواب ہے، قرآن نے جابجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر

(۱) نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۸ (مطبوعہ مصر) بہ روایت موقوف از دارقطنی (۲) ابوداؤد کتاب الصلوۃ ابواب صلوۃ الخوف وباب صلوۃ الطالب ج ۱ ص ۱۷۸ (۳) صحیح بخاری کتاب التفسیر بقرہ باب قولہ فان خفتم رجالا الخ ج ۲ ص ۶۵۱۔

مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔

غرض انسان کی پیشانی کو خود بہ خود مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے، اندرونِ دل کی عرض نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوشِ جنوں کا علاج ممکن نہیں، وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیوں کر خالی ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں، اسلام میں اگر حمد و تسبیح ہے، تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا، پارسیوں میں زمزمہ اور ہندوؤں میں بھجن ہیں اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے، اس بنا پر یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں، قرآنِ پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو، خصوصاً ملتِ ابراہیمی میں اس کی حیثیت (۱) سب سے زیادہ نمایاں ہے، حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (ابراہیم: ۱۴-۴۰) ''اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں'' حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ

(۱) قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے اصطلاحی لفظ ''خدا کا نام لینا تھا'' چنانچہ توراۃ اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا (پیدائش ۱۲-۶ ص ۸ طبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء) حضرت اسحٰقؑ نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶، ۲۵ ص ۴۱) حضرت داؤدؑ نے خدا کا نام لیا (زبور ۱۱۶-۴ و ۱۳) ص ۸۳ و ۸۴ اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (الاعلیٰ ۸۷-۱۵) ''اور اپنے رب کا نام لیا پس نماز پڑھی'' اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں مثلاً سفر دانیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لئے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عربی لفظ ''صلوۃ'' کے ہم معنی ہے، اسی لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے (متی ۱۷-۲۱ عربی ص ۳۲ اور متی ۲۳ و ۱۴) ص ۴۲۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (ابراہیم:۱۴-۴۰) ''اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا'' حضرت اسماعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے، وَکَانَ یَأْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ (مریم:۱۹-۵۵) ''اور وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے'' حضرت شعیبؑ کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں: اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآءُ نَا (ہود:۱۱-۸۷) ''کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں'' حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْھِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ (انبیاء:۲۱-۷۳) ''اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی'' حضرت لقمانؒ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں ''یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (لقمان:۳۱-۱۷) ''اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر'' حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ:۲۰-۱۴) ''اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر'' حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (یونس:۱۰-۸۷) ''اور نماز کھڑی کیا کرو'' بنی اسرائیل سے وعدہ تھا، اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ (مائدہ:۵-۱۲) ''میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر نماز کھڑی کیا کرو'' حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے، وَھُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (آل عمران:۳-۳۹) اور وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے'' حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں، وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ (مریم:۱۹-۳۱) ''اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے''۔

آیاتِ بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔

مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَھُمْ یَسْجُدُوْنَ. (آل عمران:۳-۱۱۳)	اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں، مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح (ننگے) نہ پڑھو'' (ص ۷۲) ''تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو، بلکہ اس کو باندھ لیا کرو'' (ص ۷۳) ''نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو'' (ص ۱۱۲) ''تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور

جوتے پہنے رہو'' (ص۱۱۴) ''میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا، جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں'' (ص۸۴)(۱) ان حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔

عرب میں جو لوگ اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقۂ عبادت سے واقف نہ تھے، چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ''اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھے کیسے پوجوں؟ یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے (۲) لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے، چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت ﷺ کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے جدھر رخ کر لیا، (۳) عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے (۴)

وادرکن اعجازاً من اللیل بعد ما اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

(اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ میں اس وقت کے بعد جب عبادت گذار حنفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہبِ حنفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انھوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ (۵)

---

(۱) کنز العمال جلد چہارم طبع حیدرآباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں، اوپر متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دئے گئے ہیں۔ (۲) ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل ص۱۴۴ (۳) صحیح مسلم فضائل الصحابہ باب من فضائل ابی ذر ج۲ ص۳۴۷ و ۳۴۸ (۴) لسان العرب لفظ حنف ج اص ۳۹۷ (دار لسان العرب بیروت) (۵) دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (''ورشپ'')۔

دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل وصورت اس قدر مسخ ہوگئی تھی کہ آج بھی ان کے صحیفوں میں اس کی اصلی شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے کیا اوقات تھے، جو کچھ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم ورواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی کچھ تجویزیں جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جارہا تھا، سجدہ جو نماز کی روح اور نیازِ الٰہی کی انتہائی منزل ہے، اس کو یہود ونصاری دونوں نے مشکل اور باعثِ تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انھوں نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید میں ان کی اس صورتِ حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ. (اعراف:۷:۱۶۹-۱۷۰)	ان کے بعد ان کے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کردیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پروا نہ کریں) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے، اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے ہے جو پرہیزگار ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے ؟اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور انھوں نے نماز قائم کیا، تو اپنی حالت درست کرنے والوں کی مزدوری کو ہم برباد نہیں کرتے۔

سورۂ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (مریم:۱۹-۵۹)	ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔

نماز کے ضائع اور برباد کر دینے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اس کی حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ''ان کی خداپرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خداپرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں''۔

وَ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ.	اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔

(مائدہ:۵-۵۸)

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج وطواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، موحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کو منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:

وَمَا کَانَ صَلٰوتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً (انفال:۸-۳۴)	اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے۔

اگلے مفسروں نے اس آیتِ پاک کے دو مطلب لئے ہیں، ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی (۱) پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو ولعب تھا اور دوسرے معنی کے رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔

ایک اور آیت میں ہے:

---

(۱) ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور ج ۹ ص ۱۴۷ و ۱۴۸۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى. عَبْدًا اِذَا صَلّٰى. کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ (علق: ۹۶-۹و۱۰)

ایک بندہ سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذات ہے، آپ جب صحنِ حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے (۱) کبھی آپ ﷺ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے (۲) اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے تو پشتِ مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بارِ نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے، (۳) اسی لئے آنحضرت ﷺ اسلام کے آغاز میں تو اخفا کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر اُدھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے، مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے، ابنِ اسحاق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ (۴)

الغرض جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سر بہ سجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازیں بالعموم اخلاص واثر، سکون، دل جمعی، خشوع وخضوع اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم: آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے

---

(۱) ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور ج ۳ ص ۱۴۰ و ۱۴۱۔ (۲) صحیح بخاری کتاب المناقب باب فضل ابی بکر ج ۱ ص ۵۱۹ (۳) صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شئیا من الاذی ج ۱ ص ۷۴۔ (۴) سیرت ابن ہشام ابتداء ماافترض اللہ سبحانہ من الصلوۃ ج ۱ ص ۱۶۲۔

پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا:

يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. ''اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول'' (مدثر:۷۴-۱ تا ۳)

رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے، آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بتایا، ان جانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، ڈھکیل کر نیچے گرا دیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدے کو حرام کر دیا، اس طرح آپ ﷺ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی، آپ ﷺ نے اہلِ عرب اور دنیا کو بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مؤثر دعائیں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا، یہودیوں کو نماز کے خضوع وخشوع، راز و نیاز اور اخلاص واثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل وصورت اور روح وحقیقت دونوں کے ساتھ ناقابلِ تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا۔

حکم ہوتا ہے کہ:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ:۲-۲۳۸) نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ:

وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (انعام:۶-۹۳) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ. جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔ (معارج:۷۰-۲۳)

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔ (مومنون:۲۳-۹)

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے

ساتھ جمے رہو، فرمایا:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ:۲۰-۱۳۲)

اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو۔

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا:

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (بقرہ:۲-۲۳۸)

خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

تعریف کی گئی کہ:

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. (مومنون:۲۳-۲)

(کامیاب ہیں وہ مومن) جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

حکم ہوا کہ:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف:۷-۵۵)

تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اعراف:۷-۵۶)

اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کے ساتھ پکارو۔

وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف:۷-۲۹)

اور خدا کو پکارو، اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ: اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے، اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد وثنا کو واضح، متعین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں، یعنی کسی مذہب کے پیروؤں بلکہ ملہموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی، ورنہ جیسا کہ ابھی ابھی اوپر گذر چکا، قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں، واضح اور موکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء اور قرآنِ پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل میں ایسی منظم، واضح، موکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ ہوش وحواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبک دوش نہیں ہو سکتا، قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے، اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت (۱) اور اس کا ترک کفر کی نشانی (۲) بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستانِ قدس میں ہوئی جس کو معراج (۳) کہتے ہیں۔

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے، چنانچہ سورہ روم (۳۰:۳۰) میں پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (روم:۳۰-۳۰)

اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دینِ توحید پر سیدھا رکھو وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔

اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (روم:۳۰-۳۱)

اور نماز کو کھڑا کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیتِ پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیوں کہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں، خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”نماز دین کا ستون ہے“ جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دین داری بھی رخصت ہو جاتی ہے، طائف

---

(۱) منافقین کی صفت میں ہے کہ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (نساء:۴-۱۴۲) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں ست وکاہل ہو کر اٹھتے ہیں، ”فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. (ماعون:۱۰۷-۴و۵) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ (۲) کفار کے بارے میں ہے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ. (مدثر:۷۴-۴۳) ہم نمازیوں میں نہ تھے، یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو۔ (۳) کتبِ صحاح واقعاتِ معراج واسرا صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب کیف فرضت الصلوٰۃ ج ۱ ص ۵۱۔

کے وفد نے جب مدینہ منورہ آکر صلح کی بات شروع کی تو نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہو جانا چاہا آپ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا، لیکن نماز کے متعلق فرمایا ”جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں“ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ”نماز دل کی روشنی ہے“ (ص ۶۵) اپنی نسبت فرمایا ہے ”نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے“ (ص ۶۳) ایک تمثیل میں آپ ﷺ نے فرمایا ”انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے“ (ص ۶۲) یہ محبوبِ ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز آب زلال ہے جو آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے“ ”مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے، نماز ہی ہے، عین اس وقت جب جنابِ رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ ﷺ فرما رہے تھے ”نماز اور غلام“ (ص ۶۱) (۱)

نماز کی حقیقت: نماز کے لئے اصل عربی لفظ ”صلوٰۃ“ ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں ”دعا“ کے ہیں، اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے، اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت ﷺ نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم سلمیؓ ایک نو مسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز با جماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس میں شریک تھے، ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی انھوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا، صحابہ نے ان کو گھورنا شروع کر دیا، معاویہؓ نے نماز ہی میں کہا، تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے زانوں پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے، نماز ہو چکی تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کرتا تھا لوگوں نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا، آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ ”نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس میں انسانوں کو باتیں کرنا مناسب نہیں“ (۲)

---

(۱) یہ تمام حدیثیں کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں (۲) سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۴ (مطبوعہ کلکتہ) یہ دونوں روایتیں ہیں، ہم نے ان دونوں کو جمع کر لیا ہے۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ ''دعا عبادت کا مغز ہے'' اور حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے الدعاء ھو العبادۃ ''دعا ہی عبادت ہے'' اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی (۱) جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے:

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ. (مومن: ۴۰-۶۰)	مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عن قریب جہنم میں ذلیل وخوار ہوکر جائیں گے۔

مستدرک حاکم (کتاب الدعا) میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''بہترین عبادت دعا ہے'' اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔

قرآن پاک میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے، یعنی ''خدا کی یاد'' فرمایا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ: ۲۰-۱۴)	میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

کامیابی اسی کے لئے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی. وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی. (اعلیٰ: ۸۷-۱۴ و ۱۵)	کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی، اور خدا کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی سوزش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر واماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون واطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادرِ مطلق کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے، وحی الٰہی نے اس نقطہ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (رعد: ۱۳-۲۸)	ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثباتِ قدم اور دعا ہی چارۂ کار بنتے ہیں۔

---

(۱) یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات باب ماجاء فی فضل الدعاج ۲ ص ۱۷۵ میں ہیں، دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب الدعاج ۱ ص ۲۰۸ (کلکتہ) میں اور مستدرک حاکم کتاب الدعاج ۱ ص ۴۹۱ میں بھی ہے۔

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ:۲-۱۵۳)

ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر و توانا کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سر بہ سجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح و نماز ہے:

وَاِنۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰـكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ (بنی اسرائیل:۱۷-۴۴)

اور دنیا میں کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ (اس خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے، البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيۡرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ الۡعَذَابُ (حج:۲۲-۱۸)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا، (کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)۔

غور کیجئے! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگوں ہے لیکن استثنا ہے تو صرف انسان میں، کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے، انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثنا اطاعت گذار ہیں، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ و اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہیں سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور بندگی و سرافگندگی کی دعوت دیتی ہے، جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض و غایت: نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالقِ کل، رازقِ عالم، مالک الملک، منعمِ اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تا کہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابلِ زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی

فعل و عمل کے وقت اس کی ہشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں، جس سے ہم اپنے برے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجھکیں، اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آ کر نماز کی حقیقت دریافت کی، آپ ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! احسان کیا ہے؟ فرمایا ''یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے'' اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے، کیوں کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے'' (۱) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے سرِ مبارک باہر نکال کر فرمایا ''لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ'' (۲) ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (عنکبوت: ۲۹-۴۵)

اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى. وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى. (اعلیٰ: ۸۷-۱۴و۱۵)

کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب لیبصق عن یسارہ ج ۱ ص ۵۹ و صحیح مسلم کتاب المساجد باب النهی عن البصاق فی المسجد ج ۱ ص ۲۰۷ و مسند احمد ج ۲ ص ۳۴ و ج ۳ ص ۱۷۶ او ص ۱۸۸ و غیرہ۔ (۲) مسند احمد ج ۲ ص ۳۶ و ۶۷ و ۱۲۹۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ. (فاطر:۳۵-۱۸)	تو انھیں کو تو ہشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی قوتوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا. اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا. وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا. اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ. (معارج:۷۰-۱۹تا۲۳)	بے شک انسان بے صبرا بنا ہے، جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل، لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والوں کو قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔

نماز کے ان ہی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ ''اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ نہیں، یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا کہ ''نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے، جس طرح پانی میل کو''۔(۱)

ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (۲)

---

(۱) یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال (ج ۴ ص ۶۷ و ۶۸) میں حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں۔(۲) صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ کفارۃ ج ۱ ص ۷۵ و کتاب التفسیر تفسیر سورہ ہود ج ۲ ص ۶۷۸۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ. (ہود:۱۱-۱۱۴)

اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہبِ اسلام اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب وشرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لئے کچھ آداب وشرائط کی ضرورت: جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں، جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب ''قلب کا عالم'' اور ''فلسفۂ نفسیات'' یا ''دماغی کیفیات'' کہتا ہے، اس کے لئے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب ودماغ اور نفس وروح کے مطلوبہ اعمال وافعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہیں، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر اگر کسی خاص قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں، لیکن ان کے مناسب شکل وصورت اور ماحول (گرد وپیش) نہ اختیار کریں، تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی، ہمارے تمام تمدنی، اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم وآداب اور قواعد وضوابط مقرر ہیں، معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت وتقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم وآداب، سکون وخاموشی، ادب ولحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست وبرخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں، شاہانہ رعب وداب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے، قوی ہیکل چوب دار، عصابردار نقیب وچاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت وتاج، علم وپرچم، ماہی مراتب، نوبت ونقارہ اور دم بہ دم دور باش اور نگاہ روبرو کی پررعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لئے فضا کا سکون وخاموشی، مقام کی سادگی وصفائی، شور وغوغا اور شہر وبازار سے دوری ضروری

چیزیں ہیں، بزمِ عروسی کے لئے رنگ و بو، نور وسرور، گانا بجانا اور عیش ونشاط کا اظہار طبعی ہے۔

ان ہی طبعی ونفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات وآداب وقوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے مقصود دل کے خضوع وخشوع، توبہ وانابت، پشیمانی وشرمندگی، اطاعت وبندگی اور خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی ودرماندگی کا اظہار نیز دل ودماغ اور نفس وروح میں پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب وشرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو ونما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ اب وہ شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کئے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات میں ادب واحترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض وبرکات کی استعداد وصلاحیت پیدا ہوتی ہے، فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی وپاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی وپاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے، جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری وساری ہے، اندر کے بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کردے گا، اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے، اسی اصول کے ماتحت اسکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہم رنگی وہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہم قدم سکون ورفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں، ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پُرکیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے، اسی لئے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آ جاتا ہے، نفسیاتِ اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی ونفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب وشرائط اور ارکان ان ہی اصولوں کا نام ہے۔

ذکر ودعا وتسبیح کے دو طریقے: یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع وخشوع، ذکرِ الٰہی، حمد وثنا، اپنے گناہوں پر ندامت واستغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے، یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں، جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں، اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید وشرط کے بغیر ادا کر سکے، اس کا نام عام تسبیح وتہلیل اور ذکرِ الٰہی ہے۔ جس کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے، نہ مکان کی شرط، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے، چنانچہ خدا نے فرمایا:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ — پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

(نساء:۴-۱۰۳)

اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ صحبت سے صحابۂ کرامؓ کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ — جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔

(آل عمران:۳-۱۹۱)

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے، فرمایا:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ. — ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید وفروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

(نور:۲۴-۳۷)

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے: دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل وصورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کی جائے، اس کا نام نماز ہے، پہلا طرزِ عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے، لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اس لئے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے، اگر اس کو جماعت کے ساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی، لیکن جماعت کے ثواب وبرکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی، دوسرے لفظوں

میں ہم اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر وفکر اور تسبیح وتہلیل انفرادی طریقۂ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقاتِ مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں جس کے ادا کرنے کا حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا، کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظامِ وحدت کا اصول: اسلام کے عام فرائض واحکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سرّ الاسرار ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے، بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت وکیفیت کو تراوش کرنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کو کوئی خاص شکل وصورت، آئین وطریق اور سمت ووقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروروں مسلمانوں پر جنھوں نے دعوتِ محمدی ﷺ کو قبول کیا فرض تھی، اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر منہ کر کے چاہے ادا کرلے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا، اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروروں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔

غرض اس نظامِ وحدت کا آشکارا وہویدا کرنا توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے اور کروروں دلوں کو جو کروروں اشباح واجسام میں ہیں، ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت، واحد صورت وشکل میں، واحد اعمال وافعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے، قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم وانجمن کی وحدت، کسی مملکت وسلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظامِ وحدت

اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات: یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے، غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے، یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں، جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں، اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔

انسان کے قلبی افعال واعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا، جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعوی کر سکتا ہے اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے، جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں، مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کی مخلوق ہے، اس کی زندگی کے دونوں جز خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق و رزاق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدۂ نیاز ادا کریں، غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے ہیں۔

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال وحرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے، جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہوجاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، اور زمین پر سر رکھ دیتے ہیں، نماز کے بھی یہی تین رکن ہیں، چنانچہ آغازِ عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی، وہ انہی تین اجزا سے مرکب تھی، کھڑے ہوجانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)۔

ارکانِ نماز: معلوم ہوچکا ہے کہ ''نماز'' ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر وتطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی:

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (حج: ۲۲-۲۶)	اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف کر۔

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان کا قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریم علیہا السلام کا زمانہ سلسلۂ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا:

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ. (آل عمران: ۳-۴۳)	اے مریم اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہوکر بندگی کر اور سجدہ کر، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس نمازِ مریمی میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب: جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور ان میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے موخر ہونا ثابت ہوجائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بہ خود ثابت ہوجائے گا، چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام، رکوع اور سجود سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآنِ پاک کی حسبِ ذیل آیت سے ثابت ہے اور رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بہ خود ثابت ہوجائے گا:

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ (نساء: ۴-۱۰۲)	جب تو ان میں ہے تو ان کے لئے نماز کھڑی کرے تو چاہئے، ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لئے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے، پس لامحالہ رکوع، قیام وسجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکانِ سہ گانہ کی ترتیب یہ ہوگی، اول قیام، پھر رکوع، پھر سجود۔

صحفِ سابقہ میں نماز کے ارکان: تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظوں کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم ورواج کے مطابق کردئے ہیں جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے، بہرحال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے، ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام: ’’پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا‘‘۔ (پیدائش، ۱۸:۲۲، ص ۲۶)

رکوع: ’’اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوندا‘‘۔ (پیدائش، ۱۸:۲۲، ص ۲۵)

سجدہ: ’’اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری اور ان کے دکھوں پر نظر کی، انھوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کئے‘‘۔ (خروج ۴:۳۱، ص ۹۳)

’’تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے نوجوانوں سے کہا کہ تم یہاں گدھے کے پاس رہو، میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لئے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کرکے پھر تمہارے پاس آؤں گا‘‘۔ (پیدائش، ۲۲:۵، ص ۳۲)

’’تب اس مرد (حضرت اسحاق کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہے۔ (پیدائش، ۲۴:۲۶و۲۷، ص ۳۶)

’’اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا‘‘۔

(۲سموال ۱۵۔۳۲، ص ۵۰۸)

زبور میں حضرت داؤدؑ خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:

’’اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف سجدہ کروں گا‘‘ (زبور ۵:۷، ص ۵)

ان حوالوں سے بہ خوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیمِ الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل میں دعا ونماز کا ذکر متی ۶۔۵ ص ۱۰ و ۱۷۔۲۱ ص ۳۲ و ۲۶۔۳۶ ص ۴۹ مرقس ۱۴۔۳۳ ص ۸۳ و لوقا ۲۲۔۴۰ و ۴۱ ص ۱۳۸ وغیرہ میں ہے،

طریقۂ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) لوقا ۲۲۔۴۱ص ۱۳۸) اور دوسری میں (متی ۲۶۔۳۹ص ۵۰) منھ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عہدِ بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے، وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر توراۃ یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ. (آل عمران:۳-۱۱۳)	وہ برابر نہیں ہیں، اہلِ کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں (۱) اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔

اسلام کی نماز بھی ان ہی قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے''۔(۲)

اسلام نے صرف یہ کیا اس خزانہ کو وقف عام کر دیا، انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا، جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا۔

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح وتہلیل اور ذکرِ الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور

(۱) فتح الباری ابن حجر ج ۲ ص ۲۲۷ مصر۔ (۲) مضمون صلوٰۃ ج ۴ ص ۹۶۔

جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے، اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے، تو نماز کو اس طرح ادا کرو، جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ. فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. (بقرہ:۲-۲۳۸و۲۳۹)	نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہ داشت کرو، اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکرِ الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اسی کی تفصیل سورۂ نساء میں ہے، اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد، دوسری رکعت (۱) کے متعلق کہا گیا ہے:

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (نساء:۴-۱۰۳)	پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھے اور پہلوؤں پر یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں، اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی، اس کو ''الصلوٰۃ'' (نماز) کہا گیا، اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملے اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی، اس کو صرف ''ذکر اللہ'' کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو ''اقامتِ صلوٰۃ'' (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالاں کہ ذکرِ الٰہی تسبیح وتہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے، بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، حمد وثنا اور تلاوتِ قرآن سے جداگانہ ہیں، یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر وفکر، تسبیح وتہلیل، حمد وثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں، جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بہ دستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو، جس طرح اس نے اس نے بتایا ہے۔

(۱) اس کی تشریح میں فقہاء کا اختلاف ہے، میں نے یہاں وہ لکھا ہے جو میرے نزدیک صحیح ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے، گو اس کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہؓ کو کس طرح کی نماز سکھائی، کیوں کہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے، اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے اور اسلام کو ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلّم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لئے قرآنِ پاک سے ان کا ثبوت بہم پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں:

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ. (بقرہ:۲-۲۳۸)	نمازوں پر عموماً اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو، اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ:

وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی○ (اعلیٰ:۸۷-۱۵)	اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔
وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ○ (مدثر:۷۴-۳)	اور اپنے رب کی بڑائی کر۔

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں:

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ. (طور:۵۲:۴۸)	اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

پھر قرآن پڑھتے ہیں:

فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل:۷۳-۲۰)	قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا. وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا. (بنی اسرائیل:۱۷-۱۱۰و۱۱۱)	کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں، اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ اور نہ بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کر، اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے، اور اس کی بڑائی کر، بڑی بڑائی۔

چونکہ اس کی یہ حمد سورۂ فاتحہ میں بہ تمام وکمال مذکور ہے، اسی لئے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں، اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے، اس کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے ہیں، یعنی رکوع کرتے ہیں:

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (بقرہ:۲-۴۳) اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

پھر اس کے آگے پیشانی زمین پر رکھ دیتے ہیں، یعنی سجدہ کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (حج:۲۲-۷۷) اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو، اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو، تاکہ کامیاب ہو۔

ان دونوں (رکوع وسجدہ) میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ. (واقعہ:۵۶-۷۴) تو اپنے بزرگ پروردگار (رب عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (اعلیٰ:۸۷-۱) اپنے برتر (رب اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے(۱) قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورۂ حج (۲۲:۲۶، ذکر ابراہیم) اور آل عمران (۳:۴۳، ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے، سورۂ نساء (۴:۱۰۲- ذکرِ نماز خوف) سے ثابت ہے کہ درحقیقت ارکان کی ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، جب کیفیات وجذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرطِ بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بلندترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ جسم یعنی پاؤں پر رکھ دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے، قرآن نے کہا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ. (علق:۹۶-۱۹) اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔

گویا سجدہ قربتِ الٰہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لئے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے: قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے جس کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور

(۱) ابن ماجہ ابواب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود ص ۶۴۔

سرنگوں کرنے کا حکم ہے، مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح وتحمید کا حکم ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع وخشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی ہے کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یک جا ہو گئے، اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گونا گوں، جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قرأتِ قرآن، ذکرِ الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہیں، ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے، جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں، دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کرلے، جو چاہے سجدہ کرلے، جو چاہے صرف قیام کرلے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر وقرأت پر اکتفا کرلے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے، تو ہر فرد سے فرائضِ الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے، جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انکاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہو سکتی اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادتِ خاص کہا جا سکتا، اور نہ جماعتی رمز وشعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی (۱) اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسلٍ موجودہ اور آئندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جس میں ذرا بھی شک وشبہہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا: نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جا سکتی ہیں، خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کے نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے، جس کو آپ نے تمام عمر نماز

(۱) موطا امام مالک باب وقوت الصلوٰۃ ص ۲ مطبع احمدی دہلی وصحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب مواقیت الصلوٰۃ وفضلہا ج ۱ ص ۷۵۔

کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لئے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے، جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منھ سے ادا کی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ. اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ. اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ. صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ. (فاتحہ:۱:۱تا۷)	حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے، رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدلہ کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو سیدھا راستہ چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا، اور نہ ان کا جو بہک گئے۔

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں، یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز میں دہراتا ہے، جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے(۱) یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستایش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا وسزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق وہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت ''کل جہانوں کا پروردگار'' زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام ترقدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، سب سامنے آجاتی ہیں، ''جہانوں'' کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے ''سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار'' کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، انسان ہوں کہ حیوان، چرند ہوں کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے، خدا کو رحمان ورحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابلِ بیان کیفِ محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے ''روزِ جزا کے مالک'' کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال وجبروت سے مرعوب کر دیتا ہے ''ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں'' کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ وبن سے اکھاڑ دیتے ہیں، ''ہم تجھ

(۱) جامع ترمذی ابواب تفسیر القرآن ومن سورۃ فاتحۃ الکتاب ج۲ص۱۲۴دیوبند۔

ہی سے مدد مانگتے ہیں"بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے اور سب سے بے نیاز ہوکر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں، سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے، اس کی شریعت کے احکام ہیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ . وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَانُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَاقُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ . وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

(انعام:۶-۱۵۲تا۱۵۴)

کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں، جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر میں فحش ہوں یا باطن میں، اور جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو مت مارو، لیکن انصاف کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو، اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے، یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے، جب تم بات بولو تو انصاف کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحیِ محمدی ﷺ کی اصطلاح میں "صراط مستقیم" کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا، (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمان داری، بلا رورعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کو "صراط مستقیم" کی مختصر سی ترکیبِ توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں۔

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل وانعام ہوا، یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کردی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (نساء:۴-۶۹)	اور جو خدا اور رسول ﷺ کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں، جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی، نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ، ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لئے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) علی قدر مراتب چل چکے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دوطرح سے ہوتا ہے، (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے، اور ہر قوم کا انعام واکرام چھین لیا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں، جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کردیں، دوسری کا نمونہ یہود ہیں، جنہوں نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام واکرام سے محروم ہوگئے، مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الٰہی ہم کو دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورۂ فاتحہ) دین ودنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم وروح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق وایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا:

"جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لئے ہے اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب الحمدللہ رب العالمین (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندے نے میری ستایش کی" پھر جب وہ الرحمن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندے نے میری تعریف کی" پھر وہ کہتا ہے کہ مالک یوم الدین (نیک وبد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے "میرے بندے نے میری بڑائی ظاہر کی" اتنا میرا حصہ ہے

اور میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک یہ ہے کہ ’’اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ‘‘ (ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراطِ مستقیم دکھا) میرے بندے کی دعا ہے اور میرے بندے نے جو مانگا وہ اس کو ملا‘‘ (۱)۔

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کا جو دل کش و دل فریب نظارہ نظر آتا ہے، وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یوروپین فاضل اے، جی، وینسنک (A. G. Wensink) کو بھی جس نے انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پراز معلومات مضمون لکھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

’’(اسلام کے رو سے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے، ایک دفعہ محمد ﷺ نے ایک پرنقش ونگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے، یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع وخشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمد ﷺ نے کہا ہے کہ ’’مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے‘‘ محمد ﷺ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے، نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم دو حدیثوں میں پاتے ہیں، جن میں بیان ہے کہ ’’نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے‘‘ اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ ’’سورۂ الحمد میرے اور میرے بندے کے درمیان بٹی ہوئی ہے‘‘ (۲)

اس دعائے محمدی ﷺ کا موازنہ دوسرے انبیاء کی منصوص دعاؤں سے: دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو، اور نماز میں پڑھنے کے لئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، کوہِ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ ’’داؤد کی نماز‘‘ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزء ہے، ان دعاؤں

(۱) جامع ترمذی ابواب التفسیر تفسیر فاتحه باب جاء فی الذی یفسر القرآن برایه ص ۴۸۰ مطبع احمدی دہلی ۱۲۶۶ھ و مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۴۶۰ (مصر)۔ (۲) یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔

کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسنِ تعبیر، جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہوگا، اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لئے اسی کا حکم ہوا۔ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت اُبیؓ سے فرمایا تھا کہ ''نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ تو توراۃ میں اتری اور نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے'' (۱) اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا: توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے کوہِ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدے میں گر پڑے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی۔

> ''خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیما اور رب الفیض و وفا، ہزار پشتوں کے لئے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہیں کرے گا بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے، تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا'' (۳۴۔۶ و ۷ ص ۱۴۴)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے، پہلے فضل ورحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا: زبور باب ۸۶ (ص ۶۲ و ۶۳)

داؤدؑ کی نماز

> ''اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دین دار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے، اے خداوند! مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوندا میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری

---

(۱) جامع ترمذی فضائل سورہ فاتحہ ص ۴۶۸ مطبع احمدی۔

رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں، وافر ہے۔

اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنے گا، معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہیں، اور تیری صنعتیں کہیں نہیں، اے خداوند ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا، آئیں گی اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا، میں تیری سچائی میں چلوں گا، میرے دل کو یک طرفہ کر، تا کہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا! میں اپنے سارے دل سے تیری ستایش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہے۔

اے خدا! مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انھوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا، لیکن تو اے خداوند! خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوں، کیونکہ تو نے اے خداوند! میری مدد کی اور مجھے تسلی دی''۔

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد وصفت اور توحید وعبادت کا ذکر، راہِ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گم راہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طولِ تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا: حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں:

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر، جیسے ہم بھی اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں، اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا، کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔'' آمین'' (لوقا-۱۱:۲ تا ۴ص ۱۱۴)

نام کی تقدیس ''خدا کی حمد'' ہے، بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استعارہ کی زبان میں ''روز کی روٹی'' سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے بلکہ روح کی غذا صراطِ مستقیم لی جائے، اور ''قرض'' سے مراد فرائض یا حقوق لئے جائیں، جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں، ''آزمائش'' میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے وہی معنی لئے جاسکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمہ میں مذکور ہیں، ''نہ ان کا راستہ، جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں''۔

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبانِ نبوت سے ادا ہوئیں، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیلِ دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آسکتی ہے، دعائے محمدی ﷺ تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ میں ایسی عالم گیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کرسکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں، اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت ''قرض'' لینے پر آمادہ کرتے ہوں'' نیز وہ خدا کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہوسکتا (یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالم گیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں، مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراضِ ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے، طرزِ بیان خدا اور بندے کے شایانِ شان ہے، درخواستیں حد درجہ مودبانہ ہیں، اوصافِ الٰہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہوسکتے ہیں، دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے، للّٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندے کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے، یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت،

اور بندے کے خشوع وخضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع مختصر اور پر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟

نماز کے لئے تعیینِ اوقات کی ضرورت: نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقاتِ نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس دینِ کامل کو لے کر مبعوث ہوئے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسیاتی (سائیکولاجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرلے، کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا، اسی لئے ہر منظم، باقاعدہ اور دائمی عمل کے لئے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لئے اختیار کیا ہے، اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہوجاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گذر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لئے اوقات متعین ہوجاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے، اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلاناغہ انجام پاتے جاتے ہیں۔

اوقاتِ نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مدنظر ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصولِ وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہروں اور ملکوں اور اقلیموں میں ہزاروں لاکھوں اور کروروں کی تعداد میں آباد ہیں، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے، کرۂ ہوا میں لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروروں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالقِ عالم کے سامنے سرنگوں پاؤں گے اور جہاں تک مطلع ومغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا، یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہے گا، مختلف ملکوں

میں طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وہاں ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحہ ارضی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں: اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعیین کی اسی مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوعِ آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو تفِلاّ کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے:

> ''جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھری کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا، دعا اور شکر گزاری (حمد) کرتا رہا.......... پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے''۔ (۶: ۱۰ تا ۱۳ اص ۱۲۷۳)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے:

> ''پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچالے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا، سو وہ میری آواز سن لے گا''۔ (۵۵-۱۶-۱۷ اص ۳۹)

اسلامی اصطلاح میں، ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں:

حضرت عیسیٰؑ نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے:

> ''پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضرور ہے ایک تمثیل کہی''۔ (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے۔

''پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا'' (اعمال ۱۰۔۹ ص ۲۰۷)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے:

''پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے'' (اعمال ۳۔۱ص ۱۹۳)

یونانی میں تیسرے پہر کے بجائے ''نویں گھڑی'' کو لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰۔۳۰ ص ۲۰۹ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

''اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا، ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند! ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا، اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو............ اس نے ان سے کہا تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو، اور وہ آدھی رات کو اس کے پاس آ کے کہے، اے دوست مجھے تین روٹی ادھار دے'' (لوقا۔۱۱، ۱ تا ۵ ص ۱۱۴)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نمازِ تہجد میں مصروف تھے۔ (لوقا ۲۳۔۳۹ ص ۱۳۸)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے ''اور بڑے تڑکے کے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی'' (۱) بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہِ راست یونانی (۲) سے ہوا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دواماً اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے، او فی الصبح باکراً جدا قام وخرج ومضی الی موضع خلاء وکان یصلی ھناک یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کرلیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵۔۱۶ و ۱۷ ص ۳۹) میں صبح کا مرقس (۱۔۳۵ ص ۵۷) میں عصر کا اعمال (۳۔۱ ص ۱۹۳ و ۱۰۔۳

(۱) مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء۔ (۲) مطبوعہ مطبع ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء ص ۵۷۔

ص ۲۰۷و۳۰ص ۲۰۹) میں ہے اور عشاء رات کی نماز کا لوقا (۱۱-۱اص ۱۱۵و۲۲-۳۹ص ۱۳۸) میں۔

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات: اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر کر دئے، ہر انسان، ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو یہ بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر ستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تا کہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور کے ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حی علی الصلوٰۃ کا نغمۂ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لئے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتابِ زندگی میں حیاتِ امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدھی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دن کا آدھا کام بہ خیر و خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام کو شروع کرنے لگتا ہے تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کے نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی بااحساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخرِ عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیئے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لئے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے، اسی طرح عشاء سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے، کہ یہ وقت صرف خوابِ راحت کے لئے موزوں ہے ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، ان ہی کام کے اوقات کے شروع میں نمازِ پنج گانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقاتِ نماز میں ایک نکتہ: اوقاتِ نماز کی تعیین میں اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تاب ناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ نیم روز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا(۱) حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، ملتِ ابراہیمی میں نماز کے اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے تا کہ یہ اوقات خود زبانِ حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے، جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغ دار ہے، دین محمدی ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی میں تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی تین دور ہوتے ہیں، جب (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرۂ تقابل سے نیچے اترتا ہے، جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرۂ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے، جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقاتِ انحطاط میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح

(۱) قرآن پاک سورہ انعام ۶: ۷۹۔

ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہوجاتا ہے، اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل:۱۷-۷۸)	نماز کھڑی کر، آفتاب کے انحطاط کے وقت سے رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔

(تفصیل آگے آتی ہے)

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت، اس کے عروج وکمال کے وقت اور اس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔(۱)

اسلام میں طریق واوقاتِ نماز: نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں اور گنے گنے رکعتیں کر کے پڑھنی چاہئے اور اس کے کیا کیا آداب وشرائط ہیں، ان سب کے لئے قرآنِ پاک میں ایک جامع آیت ہے، جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے:

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ. فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. (بقرہ:۲-۲۳۸و۲۳۹)	نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اور اللہ کے لئے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر (دشمنوں کا) خوف ہو تو پیادہ ہوکر، یا سوار ہوکر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا، جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔

اس آیتِ پاک سے یہ بات بہ تصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہئے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآنِ پاک کی اس اجمال کی تفصیل سنتِ نبوی ﷺ کے ذریعہ احادیث میں تحریراً اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسلٍ متفقہ تواترِ عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآنِ پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الاوقات التی نهی عن الصلوۃ فیها ج ا ص ۳۰۶ ومابعد۔

نمازوں کی پابندی ونگرانی: اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہ داشت رکھیں اور ان پر مداومت کریں، قرآن پاک میں نماز کی پابندی، نگہ داشت اور مداومت کے لئے ایک خاص لفظ ''محافظت'' کا استعمال کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بہ شرائط ادا کرنا سب داخل ہیں، فرمایا:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ:۲-۲۳۸)	نمازوں کی نگرانی کرو۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (معارج:۷۰-۳۴)	اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (مومنون:۲۳-۹)	اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔
وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (انعام:۶-۹۳)	اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا:

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ. (معارج:۷۰-۲۳)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہوسکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں: اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں، ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا. (نساء:۴-۱۰۳)	بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

اس آیتِ پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لئے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں: ادائے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہیں، صلوٰۃ یا اقامتِ صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح وتحمید اور یادِ الٰہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا جزءِ اعظم تسبیح وتحمید ہے، احادیث میں

بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں (۱) اور اشعارِ عرب (۲) ولغتِ عرب (۳) سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہوسکتی، کیوں کہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہوسکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہئے:

۱۔ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا. نِصْفَهٗٓ اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا. اَوْزِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا. (مزمل-۷۳:۲ تا ۴)	۱۔ رات کو کھڑا رہا کر، مگر کچھ کم، یا آدھی رات، یا اس سے کچھ گھٹادے یا بڑھالے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔
۲۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْکَارِ. (مومن:۴۰-۵۵)	۲۔ اور اپنے پروردگار کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر۔
۳۔ وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. (احزاب:۳۳-۴۲)	۳۔ اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔
۴۔ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا. (فتح:۴۸-۹)	۴۔ اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔
۵۔ وَاذْكُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَاتَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ. (اعراف:۷-۲۰۵)	۵۔ اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور ڈر کر اور پست آواز میں صبح کو اور سہ پہر کو یاد کر، اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔
۶۔ وَلَاتَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (انعام:۶-۵۲)	۶۔ اور (اے رسول) ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم باب استحباب صلوۃ الضحی مارایت رسول ﷺ یصلی صبحۃ الضحی قط وانی لا سبحھا ج ۱ ص ۲۶۸ نیز صحیح مسلم کتاب صلوۃ المسافرین باب جواز النافلۃ علی الدابۃ ج ۱ ص ۲۶۲-۲۶۳ و باب و کنت اسبح فقام قبل ان اقضی سبحتی مسند احمد ج ۶ ص ۱۱۸ (۲) اعشی وائل کا شعر ہے:

وسبح علی حین العشیات والضحی ☆ ☆ ولا تحمد الشیطان واللّٰہ فاحمدا (شعراء الجاھلیۃ ج ۳ ص ۳۶۵ و کتاب شعراء النصرانیہ (قسم ثالث فی شعراء بکر بن وائل من بنی عدنان) ص ۳۶۵ بیروت ۱۸۹۰ء

(۳) لسان العرب جلد ۲ ص ۸۲ مصر۔

۷۔ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ.
الآیة.
(نور:۲۴-۳۶)

۷-ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور اس کا کہ ان میں خدا کا نام لیا جائے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

۸۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ (کہف:۱۸-۲۸)

۸-اور تو (اے رسول ﷺ) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہ، جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔

۹۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِیْنَ تَقُوْمُ. وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ. (طور:۵۲-۴۸و۴۹)

۹-اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصہ میں اس کی تسبیح کر، اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

۱۰۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (ہود:۱۱-۱۱۴)

۱۰-اور نماز قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا. وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (بنی اسرائیل:۱۷-۷۸و۷۹)

۱۱-اور نماز کو قائم کر، آفتاب کے جھکاؤ کے وقت، رات کی ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا، بے شک فجر کا پڑھنا پُرحضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ۔ (تہجد)

۱۲۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا. وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا.
(دہر:۷۶-۲۵و۲۶)

۱۲-اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر، صبح کو، سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر۔

۱۳۔ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰی. (طٰہٰ:۲۰-۱۳۰)

۱۳-کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ، آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔

۱۴۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ. (روم:۳۰-۱۷و۱۸)

۱۴-تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو، اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کرو۔

۱۵۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ. وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ.

(ق:۵۰-۳۹و۴۰)

تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ، آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد۔(۱)

۱۶۔ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ

(نور:۲۴-۵۸)

فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں، مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے صحابہؓ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام، فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ہیں، غدو، غداۃ، بکرۃ، فجر، قبل طلوع الشمس اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل، عشی اور قبل غروب الشمس سے مراد عصر، دلوک الشمس (زوال) اور حین تظھرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرفی النھار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من آناء الّیل (کچھ رات گزرے) غسق الّیل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوٰۃ العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں، جن میں خدا کی یاد اور تسبیح وتحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

---

(۱) جمہور کے نزدیک اس کا ترجمہ ہوگا سجدہ کے بعد اور عام اہل تفسیر نے اس سے فرض نمازوں کے بعد کی تسبیح وتہلیل مراد لی ہے۔

اوقات کی تکمیل

نماز کے اوقات کی تدریجی تکمیل: اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا، اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں اِدھر اُدھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے، یہ آیتیں آئی ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا. نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا. اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا. اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا. اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا. اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا. (مزمل:۷۳-۱تا۷)	اے کملی اوڑھ کر سونے والے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عن قریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں، یعنی (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیتِ قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔

نماز کا یہ طریقہ غالبًا ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جاسکتی تھی، کیوں کہ جہاں وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء۔۲۶:۲۱۴) (اپنے قریب کے خاندان کو ہشیار کرو) کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ. الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ. وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ. اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (شعراء:۲۶-۲۱۷تا۲۲۰)	اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ، جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے، جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا دیکھتا ہے، بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے

اور کون سویا ہوا ہے، جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پُر خطر حالت میں آپ کا راتوں میں تنِ تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے، اور آپ ﷺ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک نماز فجر اضافہ کی گئی:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ . وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ. (طور:۵۲-۴۸و۴۹)

اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر، جب تو نماز کو کھڑا ہو، اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی (۱) اور شاید اس وقت قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیوں کہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ ﷺ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ ﷺ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوش خبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے، سورۂ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری ہے، ان ہی معنوں کی ایک اور آیت ہے، جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا . وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا . وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا. (دہر:۷۶-۲۴تا۲۶)

تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر، اور ان مخالفوں میں سے کسی گنہ گار یا اللہ کے ناشکر گذار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب، مگر ہنوز "اصیل" (۲) میں ظہر و عصر اور من الّیل (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں

(۱) صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبیر بن مطعم ج ۲ ص ۷۲۰ (۲) اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں، جو عصر کے لئے سورہ روم میں استعمال ہوا ہے۔

ہوئی تھی، کیوں کہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی ''تسبیح وتحمید'' با قاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (ہود:۱۱-۱۱۴)

دن کے کناروں میں (۱) (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے، جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انھوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت ﷺ کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں ''تسبیح'' کے بجائے باقاعدہ ''صلوۃ'' کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَکَ وَلَا تَطْغَوْا (ہود-۱۱:۱۱۲)

پس تو سیدھا چل، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں، ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں، پہلی سے صبح کی نماز دوسری سے عصر کی، جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا، دوسری میں ظہر وعصر اور تیسری میں مغرب وعشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں، اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علاحدہ ہوتی ہیں، سورۂ ق میں جو مکی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقاتِ خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ. وَمِنَ

پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے

(۱) طرفی النھار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے، قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا - بالعشی والابکار - بالغدو والاصال اس میں پہلا طرف فجر، بکرۃ اور غدو ہے، دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے۔

اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ. پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد وتسبیح کر اور کچھ رات گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر، اور (آفتاب) کے سجدہ کرنے (۱) کے بعد (غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر)۔

(ق:۵۰-۳۹و۴۰)

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ ﷺ کی ایذا وتحقیر کے درپے تھے، اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی، ایک کی نسبت کہا گیا ومن الّیل (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وادبار السجود (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقاتِ نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبتاً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں "قبل غروب" کی نماز کہا گیا ہے، ہنوز تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر، عصر دونوں نمازیں داخل ہیں، چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی، اس کی تفصیل کی گئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل کے بعد ہے، جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے:

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ. اللہ کی تسبیح کرو، جب شام (یا رات) کرو، اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں ہے اور آخیر دن کو اس کی تسبیح کرو، اور جب ظہر کرو۔

(روم:۳۰-۱۷و۱۸)

---

(۱) آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے، اس لئے ادبار السجود سے ادبار سجود الشمس مراد ہے جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے، آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے، چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا، اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضاء یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے، چنانچہ اس معنی کے لئے سجود کا لفظ استعارتاً لایا گیا، سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے، اس طرزِ ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجودِ شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے سامنے سجدہ میں ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ، تفسیروں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایتیں ہیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔

اس آیتِ پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے، ایک کو عَشِیّ (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں ظہر کا اجمال دہر، ق، طٰہٰ، اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، ق، اور روم میں، مغرب کا بالا جمال ہود، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح ق، میں، عشاء کا بصورتِ صلوٰۃ اللیل، مزمل، طور اور دہر میں اور بصورتِ عشاء بالا جمال طٰہٰ، ہود اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے، تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طٰہٰ میں ہے، طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بہ ظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مرادلیں) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوٰتین: اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں یعنی دونوں کو ایک لفظ ’’قبل الغروب یا اصیل‘‘ یا طرفی النهار کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخری آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر وعصر کی نماروں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے مگر شام کی نماز میں اجمال ہے یعنی مغرب وعشا دونوں کو حین تمسون (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علاحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں (۱) اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علاحدہ ذکر کی گئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

---

(۱) موطا امام مالک (الجمع بین الصلوتین فی الحضر والسفر ص ۶۰ مطبع احمدی دہلی) و مسلم کتاب المسافرین باب جواز الجمع بین الصلوتین فی السفر ج ۱ ص ۲۶۳ و ۲۶۴ و ترمذی ابواب السفر ماجاء فی الجمع بین الصلوٰتین ج ۱ ص ۱۲۴۔ بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی ﷺ میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں، (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں فاضل وینسک کو بھی یہی شبہہ ہوا ہے، دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

اوقاتِ پنجگانہ اور آیتِ اسراء: محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنج گانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنج گانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورۂ اسراء (معراج) میں نماز پنج گانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنج گانہ کی تکمیل بہ صورت صلاۃ اسی معراج میں ہوئی، جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے، سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنج گانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا. (بنی اسرائیل: ۱۷-۷۸)	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر، بے شک فجر کی قرأت میں حضور ہوتا ہے۔

یہ آیتِ کریمہ اوقاتِ پنج گانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے اس میں سب سے اہم تشریح کے قابل لفظ ''دلوک'' ہے، دلوک کے اصلی معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ ''دلوک الشمس'' یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہل عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے، زوال پر، مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نہیں، نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی تھیں، البتہ بہ ضرورت ظہر اور عصر کو ایک ساتھ اور مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے، رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں، صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی، فقہاء میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یک جا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے، احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف دو موقعوں پر ہے اور دونوں حج میں ایک عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لئے ہے اور دوسرے اسی تاریخ کو مزدلفہ میں مغرب اور عشاء، دونوں عشا کے وقت ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں کیونکہ مغرب کا وقت عرفات سے مزدلفہ تک آنے میں عموماً گذر جاتا ہے، بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یک جائی نہیں بلکہ محض صورتاً دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جا سکتی ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز آخر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے۔ حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقتاً دو نمازیں یک جا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے، شیعوں میں ظہر اور عصر ایک ساتھ اور مغرب اور عشا ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو، تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی، غرض یہ ہے کہ اوجِ کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرۂ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی وتردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار واعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح ''دلوک'' کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت ''غسق اللیل'' (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشاء کی نماز ہے اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہئے، جب آفتاب کا چہرۂ نورانی تو برتو حجابات ظلمت میں چھپ جاتا ہے لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی تا کہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت ''قرآن الفجر'' (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ عن قریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست، عن قریب مبتلا ہونے والے ہیں، تبری ظاہر کرے، غرض اس آیتِ پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقاتِ پنج گانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلامِ عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلامِ عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقاتِ پنج گانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق: مفسرین میں سے بعض نے ''دلوک'' سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہلِ لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں، یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے۔(۱)

ودلكت الشمس تدلك دلوكا غربت وقيل اصفرّت ومالت للغروب، وفي التنزيل العزيز أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْل وقد دلكت زالت عن كبد السماء.	آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا اور کہا گیا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا اور غروب کے لئے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ ''دلوکِ شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر'' اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ

(۱) ج ۱ ص ۱۰۰۵ بیروت۔

آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا۔

وقال الفرّاء عن ابن عباس فی دلوک الشمس انه زوالها الظهر قال ورأیت العرب یذهبون بالدلوک الی غیاب الشمس، قال الشاعر

هذا مقام قدمی رباح
ذبّب حتی دلکت براح

اور فرّاء نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دلوکِ شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہلِ عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے:

''یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا۔

یعنی الشمس، قال ابو منصور وقد روینا عن ابن مسعود انه قال دلوک الشمس غروبها وروی ابن هانئی عن الاخفش انه قال دلوک الشمس من زوالها الی غروبها وقال الزجاج دلوک الشمس زوالها فی وقت الظهر وذلک میلها للغروب وهو دلوکها ایضا یقال قد دلکت براح وبراح ای قدمالت للزوال حتی کاد الناظر یحتاج اذا تبصرها ان یکسر الشعاع بصره براحته.............

ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ''دلوکِ شمس آفتاب کا غروب ہے'' اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ ''دلوکِ شمس زوال سے غروب تک ہے'' اور زجاج نے کہا کہ ''دلوکِ شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے'' محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براح و براح یعنی آفتاب زوال کے لئے جھک گیا، یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا چاہے تو اس کی کرن کی شدت کو توڑنے کے لئے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہو۔.............

....

فان قیل مامعنی الدلوک فی کلام العرب قیل الدلوک الزوال ولذٰلک قیل للشمس اذا زالت نصف النهار دالکة وقیل لها اذا افلت دالکة لانها فی الحالتین زائلة.............

تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لئے آفتاب کو ''دالکۃ'' کہتے ہیں، جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے، تب بھی اس کو ''دالکۃ'' کہتے ہیں، کیوں کہ ان دونوں حالتوں میں وہ جھک جاتا ہے۔.............

....

....

قال الفرّاء فی قوله براح جمع راحة وهی الكف يقول يضع كفه علی عینیه ینظر هل غربت الشمس بعد..........

فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے، یہ راحہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے، عجاج کہتا ہے:

والشمس قد کادت تکون دنفا ادفعها بالراح کی تزحلفا (۱)

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا کہ وہ ہٹ جائے۔

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے، دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمتِ نظر سے ہٹتا ہے، اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کی آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمتِ افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے، ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانے پر مشتمل ہیں، بعض اہلِ لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالاں کہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمتِ افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل: ۱۷-۷۸) آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔

(۱) یہ شعر تفسیر طبری ج ۱۵ ص ۸۶ میں آیت مذکورہ کے تحت میں اور لسان العرب میں دنف ج ۱ ص ۱۰۱۹ اور زحلف ج ۲ ص ۱۶ کے تحت میں مذکور ہے۔

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیوں کہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا (دلوک) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمتِ افق سے ہوتا ہے(۱) اس کے بعد غسق الّیل (رات کی تاریکی) اور قران الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیتِ پاک سے جو اسراء میں واقع ہے اوقات پنج گانہ میں اقامتِ صلٰوۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز: اس آیتِ کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلانِ اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے، جس میں بذریعہ جبرئیلؑ نماز کے اوقاتِ پنج گانہ کی تعلیم کا ذکر ہے(۲) اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے، پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا ظہر کے بعد، عصر پھر مغرب پھر سونے سے پہلے، عشاء، یہ چار نمازیں تقریباً، دو تین گھنٹوں کے فاصلے سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فصل ہے، چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے، اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے، غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقاتِ پنج گانہ کی ایک اور آیت: سورۂ بنی اسرائیل کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے، جس میں اوقاتِ پنج گانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے:

---

(۱) تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے ان ہی نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباسؓ زوالِ آفتاب مراد لیتے ہیں، اسی طرح غسق الليل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشا سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک الشمس سے ظہر اور عصر اور غسق الليل سے مغرب اور عشا اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقاتِ پنج گانہ کو بتاتی ہے۔ (۲) سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیتِ صلٰوۃ ج ۱ ص ۱۵۶ مطبع محمد علی مصر۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (طٰہٰ:۲۰-۱۳۰)	اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس (آفتاب) کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔

اطراف النہار کی تحقیق: یہ شبہہ کیا جاسکتا ہے کہ ''اطراف'' کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بناپر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں، صبح اور شام، یا تین ہیں، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر اور شام، پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے، اور ظہر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آجاتی ہے، مگر پھر صبح مکرر رہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے مگر کلامِ عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین ''دو مشرق'' اور ''دو مغرب'' ہے، دوسری جگہ ان ہی کو ''مشارق'' اور ''مغارب'' کہا گیا ہے، سورۂ تحریم میں ہے، فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (التحریم ۶۶:۴) (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں گے، قلوب (بصیغۂ جمع) نہیں ہوسکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے، اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بناپر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں، یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے ان ہی دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں، صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبها کے اندر مستقل موجود ہے، اس لئے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقۂ ثبوت: اگر ہم قرآنِ پاک کی علاحدہ علاحدہ آیتوں سے اوقاتِ پنج گانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، مثلاً:

۱۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸)	زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔

یہ ظہر کی نماز ہے۔

۲۔ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ. (ق:۵۰-۳۹)	اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کر۔

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا.(۱) اور اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر کو

(دہر:۷۶-۲۵)

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو وَالصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی (بقرہ:۲:۲۳۸) (بیچ کی نماز) سورۂ بقرہ میں اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

۳- وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ (ہود:۱۱-۱۱۴) اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر۔

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

۴- مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ (نور:۲۴-۵۸) صبح کی نماز سے پہلے۔

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، اور پھر اسی میں اسی موقع پر ارشاد ہے:

۵- مِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَآءِ (نور:۲۴-۵۸) اور عشا کی نماز کے بعد۔

اس کے رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقات نماز ہیں۔

نماز پنج گانہ احادیث وسنت میں: تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت ﷺ کو جو خاص تفوق وامتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ جو شریعت لے کر آئے، اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ ﷺ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرمادی اور خود عمل فرما کر اور اپنے تمام پیرووں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریقِ عبادت کو پیش کیا، آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان وآداب وشرائط واوقات وتعداد کی پوری تشریح فرمادی اور ان میں سے ہر چیز ناقابلِ شک قولی وعملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہیے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہیے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیے، کس وقت کی نماز کی کے رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی آپ ﷺ نے زبانی تشریح فرمائی، صحابہؓ کو تلقین کی اور عملاً ثبوت

(۱) الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوھری ولسان العرب ج۱ ص۶۹)۔

کی پوری زندگی میں جو حکمِ نماز کے بعد گذری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعتِ مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے، یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بہ دستور اس پر عمل ہوتا رہا، مدینہ کی مسجد نبوی ﷺ اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلانِ نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپ ﷺ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروانِ محمدی ﷺ جہاں بھی رہے اور جہاں پہنچے، اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشہاد سفر و حضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے، کیا ایسی مستمر علی الاعلان، متواتر اور دائمی چیز میں کسی کو شک واقع ہو سکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار اور یہ تاکیدِ بلیغ اس لئے فرمائی تا کہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریقِ عبادت بعد کے پیرووٗں کے ترکِ عمل سے مشتبہ اور عدمِ صحتِ نقل سے مشکوک ہو گیا، خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعتِ آخریں کا طریقِ عبادت اس سے محفوظ رہے، کیوں کہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا، تو پھر کوئی دوسری نبوت آکر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدی ﷺ میں آپ ﷺ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایتاً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں، نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیتِ خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعتِ سعید میں دیا، جب آنحضرت ﷺ معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے، حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں، جو پچاس (۱) نمازوں کے حکم میں ہیں، قرآنِ پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا (انعام:۶-۱۶۱) یعنی جو ایک نیکی کرے گا، اس کو دس گونہ ثواب ملے گا، اس لئے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقاتِ خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی (۲) اور وہی آپ ﷺ نے اپنے پیرووٗں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔

---

(۱) بخاری کتاب الصلوٰۃ باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء ج۱ص۵۰ و باب حدیث الاسراء ج۱ ص۵۴۹ و مسلم باب الاسراء برسول اللہ و فرض الصلوٰت ج۱ص۷۷،۹۷ و ابوداؤد وغیرہ۔ (۲) صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب مواقیت الصلوٰۃ و فضلها ج۱ص۷۵ و صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ باب اوقات الصلوٰت الخمس ج۱ص۲۲۸ و مابعد۔

چنانچہ آپ ﷺ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ واعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمتِ اقدس میں آ کر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ فرمایا ہاں سچ ہے، عرض کی اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کہ کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، فرمایا (۱) ہاں!۔

خود آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جبرئیلؑ اترے اور انھوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک، دو تین، چار، پانچ گنتے جاتے تھے (۲) ایک دفعہ صحابہؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں نہیں رہے گا، فرمایا تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے (۳) اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے۔ (۴)

ابوہریرہؓ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قرأت کرتے تھے، اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا، اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ ﷺ تامل نہیں فرماتے تھے، (۵) حضرت جابرؓ دوسرے صحابی نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوۃ من الاسلام ج ۱ ص ۱۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ج ۱ ص ۲۴ و ۲۵ مصر۔ (۲) صحیح بخاری ج ۱ ص ۷۵ (طبع دیوبند) و صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۲۸ و موطا و قوت الصلوٰۃ ص ۲ و ۳ (۳) صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰت الخمس کفارۃ ج ۱ ص ۷۶ (۴) صحیح مسلم باب أوقات الصلوٰت الخمس ج ۱ ص ۲۲۹ (۵) صحیح بخاری باب وقت الظهر عند الزوال ج ۱ ص ۷۷۔

اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے،(۱) صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی، مغرب میں سورۃ المرسلات پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی، عشاء میں اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ اور وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ قرأت کی ہے اور صبح میں سورۂ طور پڑھی ہے۔(۲)

اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام امتیانِ محمد رسول اللہ ﷺ کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک نا قابلِ تردید حجت ہے(۳)۔

تہجد نفل ہوگئی، لیکن کیوں؟: نمازِ پنج گانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لئے نفل ہوگئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا. وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا. (اسراء:۱۷-۷۸و۷۹)	نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر، عصر، مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قرأت قائم کر، بے شک صبح کی قرأت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقاتِ مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ، شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابلِ تعریف مقام میں اٹھائے۔

غور کیجئے کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جاسکے، پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں، تو ان کے بہ قدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا کہ:

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل:۷۳-۲۰)	یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو(۴)

---

(۱) صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس اوتاخر وا ج۱ص۸۰ (۲) ایضاً باب القراۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر بہ روایت متعددۃ ج۱ص۱۰۵۔ (۳) چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقاتِ نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے، اس لئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہوجائے۔ (۴) صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ حدیث ارجع فصل فانک لم تصل ج۱ص۱۵۷ نیز دیکھو فتح الباری جلد اول ص ۳۹۳۔

اس کے بعد اس آیتِ پاک میں جب اقامتِ صلوٰۃ کے اوقات پنج گانہ کا ذکر آیا تورات کی نماز کی تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہاں ایک قابلِ ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیتِ پاک اوقاتِ نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیوں کہ اس کے نازل ہونے سے پیش تر قدیم فرض نمازِ تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ: انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہوسکتا، جس کی بنا پر اوقاتِ نماز کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا، جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منھ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منھ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم، کوئی اتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدتِ نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصا مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا، اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے، صابئ (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منھ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے، جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا، بلکہ برقرار رہتا ہے، (۱) آفتاب پرست سورج کی طرف منھ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں، اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں، یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ الیسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنا لیا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، (۲) بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے، اس جگہ کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل" بنا لیتے تھے، (۳) قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں:

وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ　اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو، اور نماز کھڑی کرو۔

(یونس-۱۰:۸۷)

---

(۱) الرد علی المنطقیین لابن تیمیة ومجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیة ج۹ ص۲۱۶ مطبع مؤسسة الرسالة بیروت۔ (۲) یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" میں ہیں ج۲۸ ص۹۸۵ لندن ۱۹۲۴ء (۳) سفر تکوین باب ۱۲-۸ عہد نامہ قدیم ص۱۹ و ۱۳-۴ ص۲۰ و ۲۸-۱۷-۱۸-۱۹ ایضاً ص۴۵ و ۳۱-۱۳ ص۵۰۔

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہدِ قدیم کے مجموعۂ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے،

حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے۔

''لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا''۔(۵-۷، مزامیر ص ۵)

سلاطین اول میں ہے۔

''جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لئے بنایا''۔(۸-۴۴ عہد نامہ قدیم ص ۵۴۸)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے۔

''اور اس زمین کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگیں''۔(۸-۴۸ ایضاً)

اہلِ عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی اس لئے اہلِ عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے:

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (بقرہ:۲-۱۴۸)	اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ منہ پھیرتی ہے تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست، آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو اور صابئ (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا.............. یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔

ابراہیمی قوموں میں اس قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانۂ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحٰقؑ اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کے متولی حضرت اسماعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے، جنھوں نے اس کو قبلہ بنالیا تھا، آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے خانۂ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے

ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیوں کہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانۂ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملتِ ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانۂ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے، جن میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (بقرہ:۲-۱۱۵)

اور خدا ہی کے لئے ہے پورب اور پچھم، تو جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے، بے شک اللہ بڑی گنجائش اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے، قطعاً غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(بقرہ:۲-۱۴۲)

بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا، جس پر وہ تھے، کہہ دے کہ پورب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ یہ اعتراض تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانۂ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتاب اور پیغمبروں پر جو ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں، یتیموں،

وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ.

غریبوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکاۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پرہیزگار ہیں۔

(بقرہ: ۲-۱۷۷)

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے، فی نفسہ عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہ تھی، لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظامِ وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی، اسی لئے ۱ھ میں خانۂ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ: ۲-۱۴۴)

پس تو اپنا منہ مسجدِ حرام (خانۂ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو، اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہیں، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جاسکے، اسی طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال سب بہ یک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہیں، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہوگیا تھا، اس کا کلیتاً خاتمہ ہوگیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کے بجائے مسجدِ حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں۔

۱- یہ ضرور تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے، ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہوسکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب جیسا کہ اوپر گذر چکا، بعض اہلِ مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء وعناصر وکواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو

وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کی پہلی سمت میں ''جگہ سے نہ ٹلنے والا'' قطب تھا اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

۲- یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہوسکتا تھا، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لئے ضرور تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہیں، کیوں کہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کی جاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے متعلق وجوہِ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بن جانا لازمی تھا۔

۳- اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے، حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدوں میں سے ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

۴- اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانۂ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا (آل عمران:۳-۹۶)

بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لئے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (بقرہ:۲-۱۲۷)

اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہدِ اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ

قرآن پاک میں ہے:

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّہِمْ (بقرہ:۲-۱۴۴)

اور جن کو کتاب دی گئی، وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)۔

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلیتون کے نام لکھا ہے، لکھتا ہے:

"کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے، دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا، (اسماعیلؑ) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا (اسحٰقؑ) سو وعدہ کے طور پر، یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ علیہا السلام ہے، کیوں کہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے، پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے۔ (گلیتون کے نام ۲۲-۲۶- باب ۴ عہد نامہ جدید ص ۳۰۹)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہِ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں، "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہِ سینا پر ہوا تھا، جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی "غلام اولاد" نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہوگئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور ﷺ کے پیش تر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرّد، سرکشی اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا، جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو، خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا، جو "سینا" پر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے متعلق باندھا گیا تھا:

معراج میں آنحضرت ﷺ کا بیت المقدس (مسجدِ اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال بعد خانۂ کعبہ کا قبلہ بن جانا گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بسلسلۂ معراج:

سُبۡحَانَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ (بنی اسرائیل: ۱۷-۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجدِ حرام (خانۂ کعبہ) سے اس مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کی چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہدِ اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہدِ اسماعیلی سے تھا، (یعنی خانۂ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ. وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰہٖمَ مُصَلًّی وَعَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَہِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ.

(بقرہ: ۲-۱۲۴و۱۲۵)

اور جب خدا نے چند باتوں میں ابراہیم کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا، خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا، میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

غرض یہ رمزِ الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا، جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، اور جو دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا، جو اس دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لئے حکم ہوا:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ:۲-۱۵۰) اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی جگہ کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے، جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر ظاہر فرمایا:

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (بقرہ:۲-۱۱۵) پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

خانۂ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں، نہ مشرکوں، بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانۂ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے، تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانۂ کعبہ کے اندر جا کر اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمتِ قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو، پڑھ سکتے ہیں، لڑائی کی حالت میں سخت خوف کی صورت میں بھی نماز کے لئے قبلہ کی قید نہیں رہتی (۱) یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانۂ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی تھیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دینِ محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے سامنے موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ "جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے وہ مسلمان ہے" (۲) اگر خیال کے پرِ پرواز سے اڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس

(۱) صحیح بخاری کتاب التفسیر، تفسیر بقرۃ باب قوله عزوجل فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ج۲ص۶۵۱۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلۃ ج۱ص۵۶۔

کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سر بہ سجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد: ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیوں کہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہوسکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بد دل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع وخشوع پیدا نہ ہوتا، کیوں کہ صرف چند سکنڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیوں کہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبرا جاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی، اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا، تو ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعتیں کردی گئیں، لیکن مسافر کے لئے وہی دو رکعتیں (۱) قائم رہیں، کیوں کہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لئے دو اور بحالت خوف ایک (۲)، اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام وسفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں اور صبح میں خود دو رکعتیں ہیں، ان میں کیا کمی ہوسکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے، ''مغرب میں تین اس لئے ہے کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لئے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کردی گئی ہے۔ (۳)

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گذر چکا ہے کہ عین

---

(۱) صحیح بخاری باب الھجرة باب مقدم النبی واصحابہ الخ ج۱ص۵۶۰ وصحیح مسلم کتاب صلوٰة المسافرین ج۱ ص۲۵۷، ۲۵۸ ومسند ابن حنبل ج۲ ص۲۴۱ وابن خزیمہ وابن حبان والبیہقی (فتح الباری جلد اول ص۳۹۳) (۲) صحیح مسلم کتاب صلوٰة المسافرین ج۱ص۲۵۸ (۳) مسند احمد ابن حنبل ج۶ص۲۴۱۔

طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا (۱) مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کریں، اسی لئے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رکھی گئی، جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے (۲) یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں، بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا، جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا، اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال وانحطاط جس کو غروب کہتے ہیں، اسی وقت ہوتا ہے، اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے وتر نماز کی تاکید فرمائی۔

اوتروا یا اھل القرآن فان اللہ وتر یحب الوتر	اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو کیونکہ خدا بھی وتر
(ابوداؤد باب استحباب الوترص ۲۰۰)	(طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔

صبح کا وقت وہ دل کش وقت ہے جب انسان پورے آرام وسکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزوں ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر اور مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز ودعا کے لئے خاص طرح سے موزوں ہے اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا.	صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔
(بنی اسرائیل-۱۷:۷۸)	

اس بنا پر شریعتِ محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بہ جائے اس کی اصلی کیفیت کو پیشِ نظر رکھا، یعنی رکعتیں دو ہی رہیں، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کر دی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں کی ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت

(۱) صحیح مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین باب الاوقات التی نھی عن الصلوٰۃ فیھا ج ا ص ۳۰۸ (۲) عشا کے بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے، یعنی تین جورات کی وتر ہے۔

فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیتوں تک قرأت کرتے تھے،(۱) اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا۔(۲)

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی سنتِ متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثناء عامل بھی ہیں، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآنِ پاک میں نمازِ خوف سے ظاہر ہوتا ہے جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آ کر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علاحدہ علاحدہ ادا کرتے ہیں (۳) جب نمازِ خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نساء کے پندرہویں رکوع میں ہیں۔

نماز کے آدابِ باطنی: قرآنِ پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہیں، مثلاً صلاۃ، دعا، تسبیح اور ذکرِ الٰہی، اور یہ الفاظ خود نماز کی روحانی خصوصیات و آداب کو ظاہر کرتے ہیں، نماز، جسم و روح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے، تو ایسی نماز گلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

اقامتِ صلاۃ: نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک میں جابجا ''اقامتِ صلوۃ'' (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں، چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے، فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (نساء:۴-۱۰۳)

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ فی الصبح ج ۱ ص ۱۷۹۔ (۲) مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ وتخفیفها فی تمام ج ۱ ص ۱۸۳۔ (۳) احادیث میں نمازِ خوف کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ہر مجتہد نے اپنی اپنی دلیل کی رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کر لیا ہے، مگر محدثین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب صورتیں جائز ہیں، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتیں لڑائی کے مختلف حالات کی بنا پر ہیں، جب جیسی صورت پیش آئی، اس کے مطابق نماز ادا کی گئی۔ جنگ میں اشاروں سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے۔

’’پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو‘‘ اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب وارکان وشرائط کے ساتھ بجالایا جائے، اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع وخشوع ملحوظ رہنا چاہئے، جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت: نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ. اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔ (بقرہ:۲-۲۳۸)

صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کرلیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ یک سوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک کی اس آیت میں جس میں قنوت کا حکم دیا گیا ہے، وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت میں (دیکھئے لسان العرب) اس کے حسبِ ذیل معنی ہیں، چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، قنوت کے ان متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے، کیوں کہ نماز میں ذکر وقرأت، تسبیح واستغفار، سلام وتشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے، اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی نماز میں کم ہو، تو اسی قدر نماز کے اوصاف میں کمی ہو جائے گی۔

خشوع: تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآنِ پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے:

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. (وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے ہیں۔ (مومنون:۲۳-۲)

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں، بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا، یعنی ہر ادا سے مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا، (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بے چارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی۔

تبتل: تبتل کے اصلی معنی ’’کٹ جانے‘‘ کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے، مگر قرآنِ پاک میں جہاں اس کا حکم ہے، سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ. قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا. نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا. اَوْزِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا. اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا. اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا. اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا. وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا. (مزمل ۷۳:۱-۸)

اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم وبیش اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں، بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے، تیرے لئے دن کو بڑی فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں، صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عنبسہؓ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی، اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جس کا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا، (وفرغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے، جیسے اس کی ماں نے اسی وقت پیدا کیا ہو(۱) یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرع: تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف:۷-۵۵)

تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو۔

اخلاص: نماز کے باطنی سنن وآداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہوگی اور بعض اہلِ حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا، فرمایا:

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف:۷-۲۹)

اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو، اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

---

(۱) صحیح مسلم اول باب الاوقات التی نہی عن الصلوۃ فیھا ج۱ص ۳۰۸۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

ذکر: ''نماز'' خدا کی یاد کے لئے ہے، اگر دل میں کچھ، اور زبان پر کچھ ہو، تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی، اس لئے فرمایا:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ. (طٰہٰ: ۲۰-۱۴) میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

ظاہر ہے کہ ''یاد'' صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم وتدبر: نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا، تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، فرمایا:

لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ (نساء: ۴-۴۳) نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیتِ پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ ﷺ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیوں کہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو'' (۱) دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ''نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہئے تا کہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے'' (۲) حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ وہ جو کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کرلے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ (۳)

---

(۱) مسلم کتاب الصلوٰۃ باب امر من نعس فی صلاتہ جلد اص ۲۹۴۔ (۲) بخاری کتاب الوضو باب الوضو من النوم ج اص ۳۴ وابوداؤد ومسند احمد عن انسؓ۔ (۳) مستدرک کتاب الطہارۃ لا یحافظ علی الوضو الا مومن ج اص ۱۳۱ (ترغیب وترہیب حافظ منذری جلد اول ص ۷۳ مطبعۃ العامرہ مصر ۱۳۲۴ھ) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے، عبرت حاصل کرنی چاہئے اور چاہئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں، ان کے معنی ذہن نشین کرلیں اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں، جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی غفلت ہے اور اس لئے اس آیتِ ذیل کے مصداق دونوں ہیں:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ. الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ. (ماعون: ۱۰۷-۴تا۶)

پس پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے ''ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو'' نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب مثلاً وقت کا لحاظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع وخضوع، تضرع وزاری، اور فہم وتدبر وغیرہ ضروری ہیں، ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپ ﷺ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، ایک دفعہ مسجدِ نبوی ﷺ میں ایک شخص نے آکر نہایت عجلت میں نماز پڑھی، آپ ﷺ نے فرمایا ''اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی'' اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، آپ ﷺ نے پھر وہی ارشاد فرمایا، جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا ''اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان اور سکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو''۔(۱)

نماز میں سر اٹھا کر اوپر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے، اس سے انسان کی توجہ ہٹتی اور حضورِ قلب میں خلل پڑتا ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز میں سر اوپر اٹھا کر نہ دیکھا کرو، کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر پھر واپس نہ آسکے'' (۲) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا، خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے'' (۳) طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ نے

(۱) صحیح بخاری کتاب الاذان باب وجوب القراءۃ للامام والماموم فی الصلوات ج۱ص۱۰۴ و صحیح مسلم باب وجوب قراۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ الخ ج۱ص۱۵۷ و ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب من صلوۃ من لا یقیم صلبہ فی الرکوع والسجود ج۱ص۱۲۴۔ (۲) مسند احمد عن جابر بن سمرہ ج۵ص۹۳۔ (۳) مسند احمد ج۵ص۱۷۲ وابوداؤد باب الالتفات فی الصلوۃ ص۱۳۱ و مستدرک ج۱ص۲۳۶۔

ارشاد فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو کیوں کہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو'' (۱) مسند بزار میں ہے کہ جب بندہ نماز میں ادھر اُدھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے ''تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ''، دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے، پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے (۲)۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا ''سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے'' صحابہؓ نے دریافت کیا (۳) کہ یارسول اللہ ﷺ نماز کی چوری کیا ہے، فرمایا ''رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع (۴) نہ ہونا'' ایک دفعہ آپ ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ ''اے فلاں تو خدا سے نہیں ڈرتا، کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے، پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے''۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے، تو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کے لئے نماز پڑھتا ہے'' (۵) نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے، آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے، تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو'' (۶) دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے'' (۷) مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا

---

(۱) طبرانی فی الاوسط عن ابی ھریرۃ بحوالہ کنز العمال جلد۴ ص۱۰۸ (۲) کنز العمال جلد۴ ص۱۰۸۔ (۳) مسند احمد عن قتادۃ و دارمی باب فی الذی لا یتم الرکوع والسجود ص۵۸ و ابن ابی شیبۃ و ابن خزیمۃ و ابن حبان و عبد بن حمید و عبد الرزاق و طبرانی فی الاوسط اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے۔ (۴) مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اول ص۲۳۶ (علی شرط مسلم) (۵) کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحسین الصلوٰۃ ج۱ ص۱۶۹ (۶) صحیح مسلم کتاب المساجد باب النھی عن البصاق فیھا ج۱ ص۲۰۶ و حاکم فی المستدرک ج۱ ص۲۵۷ و ابوداؤد باب فی کراھیۃ البصاق فی المسجد ص۶۸۔ (۷) صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المصلی یناجی ربہ ج۱ ص۷۶ و مسلم کتاب المساجد ج۱ ص۲۰۷۔

کہ ''نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے''۔(۱)

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ ﷺ نے ہدایتیں فرمائی ہیں، ارشاد ہوا کہ ''جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون و وقار طاری ہو'' (۲) اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ اور چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھالینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو (۳) اسی طرح اگر استنجا یا قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لی جائے، تب نماز پڑھی جائے (۴)۔

آغازِ اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے، لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہو گئی، ایک صحابی جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت ﷺ کو کسی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ ﷺ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انھوں نے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا (۵):

ان فی الصلوٰۃ لشغلا — نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی، پھر فرمایا ''اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لے جاؤ اور انجانی سادہ چادر لے آؤ'' (۶) اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا، آپ ﷺ نے نماز پڑھی، تو خیالات میں یک سوئی نہ رہی، آپ ﷺ نے

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب النهی عن البصاق فیها ج ۱ ص ۲۰۷۔ (۲) صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار ج ۱ ص ۲۲۵۔ (۳) صحیح بخاری کتاب الاذان باب اذا حضر الطعام واقیمت الصلوٰۃ ج ۱ ص ۹۲ ومسلم کتاب الصلوٰۃ باب کراهیة الصلوٰۃ بحضرة الطعام ج ۱ ص ۲۰۹ وابوداؤد کتاب الطهارة وترمذی باب کراهیة الصلوٰۃ بحضرة الطعام۔ (۴) صحیح مسلم وابوداؤد باب یصلی الرجل وهو حاقن ص ۱۲ وموطا امام مالک النهی عن الصلوٰۃ والانسان یرید حاجة ص ۵۶ وترمذی وحاکم کتاب الصلوٰۃ اذا حضرت الصلوٰۃ والغائط فابدؤا بالغائط ج ۱ ص ۲۵۷۔ (۵) صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ ج ۱ ص ۲۰۳۔ (۶) صحیح مسلم باب کراهیة الصلوٰۃ فی ثوب لها اعلام ج ۱ ص ۲۰۸۔

اس کو اتروا دیا۔(۱)

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میسر ہوتا ہو، اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگر چہ فوراً بعد زوال ہونا چاہئے، تاہم چوں کہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنوں میں چوں کہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا کہ "یہ دوپہر کی گرمی جہنم کی آگ ہے" اس لئے ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو:

فان الصلوٰۃ مشھودۃ محضورۃ (۲) کیوں کہ نماز میں حضور ہوتا ہے (۳)

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا "یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے" (۴) کبھی کبھی آنحضرت ﷺ پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشمِ مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے، یا ہانڈی ابل رہی ہے۔(۵)

رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت وکبریائی کا ذکر آتا، پناہ مانگتے، جب رحم وکرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے (۶) آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب، اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص رہی" (۷)۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب اللباس باب الاکسیۃ والخمائص ج۲ص۲۶۵ومسلم کتاب اللباس باب لا تدخل الملئکۃ بیتافیہ کلب ولا صورۃ ج۲ص۲۰۱۔(۲) صحیح مسلم باب النھی عن الاوقات الثلث ج۱ص۱۷۱۔ (۳) محدثین نے اس حضور سے فرشتوں کا حاضر ہونا مراد لیا ہے۔(۴) صحیح بخاری کتاب الایمان باب سوال جبرئیل النبی ﷺ ج۱ص۱۲۔(۵) ترمذی وابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ ص۱۳۰۔(۶) مسند احمد بن حنبل ج۶ص۹۲(۷) ابوداؤد باب صلوٰۃ النھار ص۱۸۳وترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوۃ ج۱ص۸۷۔

ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کر رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا ''لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو'' (۱)

ایک صحابیؓ نے درخواست کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ ہدایت فرمایئے، ارشاد ہوا کہ ''جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو'' (۲) کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ ﷺ نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (انعام: ۶-۹۳)	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہ داشت کرتے ہیں۔

نماز کی اس نگہ داشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے: نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق وتمدن ومعاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب وتہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب ومتمدن ہو جاتا ہے۔ متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلندتر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے، جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بن جاتا ہے۔

(۱) ابوداؤد صلوۃ الیل ص ۱۸۸۔ (۲) مسند احمد ج ۵ ص ۴۱۲ عن ابی ایوبؓ۔

۱۔ ستر پوشی: نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم وحیا کی نگہ داشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی:

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۷-۳۱)　　ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں نہایت ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاسکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں زیب وزینت اور حسن وآرایش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ سترِ عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲۔ طہارت: اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقرأ کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی، اس میں یہ حکم تھا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ.　　(مدثر: ۷۴-۴)　　اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہوں، اہلِ عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت ونظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی ﷺ میں

آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے دوڑے، آپ ﷺ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہے" اور صحابہؓ سے فرمایا کہ "اس نجاست پر پانی بہا دو" (۱) ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ ﷺ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا" (۲) غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی، اہلِ عرب اور عام مسلمانوں کو پاک وصاف رہنے کا خوگر بنایا اور استنجاء، بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے، جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی نا آشنا ہیں۔

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہؓ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ. (توبہ:۹-۱۰۸)

اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک و صاف رہیں اور اللہ پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے۔

۳۔ صفائی: نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منھ، ہاتھ، پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں، اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں، دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے، جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالاں کہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنج وقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس ملک میں نازل ہوا جہاں پانی سب سے زیادہ کم یاب ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الوضوء باب صب الماء علی البول ج۱ ص۳۵۔ (۲) ایضاً باب من الکبائر ان لا یستتر من بولہ ج۱ ص۳۴-۳۵۔

اہلِ عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ ''اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دے دیتا۔'' (۱)

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے، اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم (۲) جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ ۵:۶) اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

۴۔ **پابندی وقت:** انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابندِ اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چوں کہ مقرر ہیں، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بہ خود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کا مقولہ ہے:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجمعة باب السواک یوم الجمعة ج ۱ ص ۱۲۲۔ (۲) بخاری، کتاب الجمعة باب فضل الغسل یوم الجمعة ج ۱ ص ۱۲۱۔

الصلوٰۃ مکیال فمن اوفی وفی بہ ومن طفف فقد علمتم ماللمطففین(۱)

نماز ایک پیمانہ ہے، جس نے اس سے پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

۵۔ صبح خیزی: طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے، وہ مخفی نہیں جو لوگ نماز کے پابند ہیں، وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سو یا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے رات کو نمازِ عشاء کے بعد بے کار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے(۲) تا کہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو مؤذن کی پر تاثیر آواز:

الصلوٰۃ خیر من النوم

سونے سے نماز بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے۔

۶۔ خدا کا خوف: ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے، تو رحمتِ الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسّہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ

بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

(عنکبوت:۲۹-۴۵)

۷۔ ہشیاری: نماز عقل و ہوش، بیداری اور آیاتِ الٰہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل

(۱) کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ جلد چہارم ص۲۳۰ بحوالہ مصنف عبدالرزاق۔ (۲) بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب مایکرہ من السمر بعد العشاء ج۱ص۸۴۔

اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل وہوش اور فہم و احساس کو کھودیں، نماز کی حقیقت کی منافی ہیں، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا:

لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰی حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ (نساء:۴-۴۳)

نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل وہوش کو گم کردیں قطعاً پرہیز کرے گا۔

۸۔ مسلمان کا امتیازی نشان: مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے، جس کے اہلِ عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جز تھا، فخر وامتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہوسکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کردی، زکوٰۃ بھی کوئی حدِ فاصل نہیں ہوسکتی تھی، کیوں کہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ وفخر کا بھی ذریعہ ہوسکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہوسکتی تھی، فقرا کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا، کیوں کہ روزہ میں چھپے چوری کھاپی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہوسکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے، جو ان دونوں گروہوں میں حدِ فاصل ہوسکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا:

وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰی (نساء:۴-۱۴۲)

اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

نیز فرمایا:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ. (بقرہ:۲-۴۵)

اور خضوع، خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔

خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

ليس صلاة اثقل على المنافقين من الفجر والعشاء (۱)

منافقین پر فجر وعشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔

---

(۱) بخاری کتاب الاذان باب فضل صلاة العشاء فی الجماعة ج ۱ ص ۹۰ و کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب ذکر العشاء والعتمة کے الفاظ اس طرح ہیں: اثقل الصلوٰة على المنافقين العشآء والفجر ج ۱ ص ۸۰ "ض"۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ''جب ہم (صحابہؓ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے'' (۱)

مدینہ آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے، مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے، جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی چنانچہ قرآن پاک میں:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (بقرہ:۲-۱۴۳)	اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا لیکن اس لئے تا کہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں، ان سے الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا، لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی وہ مسلمان ہے (۲)

۹۔ جنگ کی تصویر: باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا، انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

کان النبی ﷺ وجیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوٰۃ علیٰ ذلک (۳)	آنحضرت ﷺ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقہ پر قائم کی گئی۔

صف بندی، ایک افسر، (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دست گیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صفِ

(۱) مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) جلد اول ص ۲۱۱۔ (۲) بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلۃ ج ۱ ص ۵۶۔ (۳) ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر ص ۳۵۰۔

جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اوران کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہوولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعاوزاری کر لینا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمدِ باری میں مصروف ہونا، اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت وتکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اوراس کے لئے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں، ہفتہ میں ایک دن نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُرآرام سے پُرآرام وقت میں ممکن تھا، مگراس کے لئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا، تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلاتِ وقت کے اتفاقات میں اس کے لئے کس قدر ممکن ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ دائمی تنبہ اور بیداری: تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیلِ اخلاق ہے، لیکن اصلاحِ اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہے، اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے، برخلاف ان کے نماز دن میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام وقعود، جہر وخفا، تسبیح وتہلیل، تکبیر وتشہد نے اس کے ارکان واعمال میں تنوع وامتیاز پیدا کر دیا ہے جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور ہر چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلبِ خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبہ ہوا کرتا ہے۔

۱۱۔ الفت ومحبت: نماز مسلمانوں میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلّہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہو گی، ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہو گی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے، قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے:

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (روم: ۳۰-۳۱و۳۲)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، ان میں سے جنھوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھابندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۱۲۔ غم خواری: بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غم خواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور امرا اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

ابتدائے اسلام میں اصحابِ صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحقِ اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہؓ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بہ خود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہؓ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہؓ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات وصدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے:

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (بقرہ:۲-۳)

اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔

۱۳۔ اجتماعیت: اجتماعیت چوں کہ ایک فطری چیز ہے اس لئے تمام قوموں نے اس کے لئے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہیں، جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کیا جاتا ہے ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں، کانفرنسوں، انیورسریوں اور دوسرے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے، لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدہ پہنچاتی ہے وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں،

اب اگران خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اوران کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی چیز پیش نہ کرتا تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا،ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے،جس سے قلبِ انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے اوراجتماعیت پیدا ہوکر بدی کے بہ جائے نیکی کے رخ کی طرف بہے،چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازیں،ہفتہ میں جمعہ کی نماز اورسال میں دودفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہواورمشرکانہ بدیوں اوراخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوتِ خیر پر رکھی گئی ہے،حج کے عالم گیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اوراقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اوراس کی بارگاہ میں توبہ وانابت کو قرار دیا،اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگیِ خیال اوراخلاصِ عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۱۴۔کاموں کا تنوع: انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہم رنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے،لیکن اگر انسان کے دل ودماغ،اعضا وجوارح ہروقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں تو سکون واطمینان،عیش وراحت اوردلچسپی کی لذت جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے،مفقود ہوجائے،مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے،اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے،جس میں انسان کو حرکت وسکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے،رات اوردن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی میں شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر وتبدل سے نظامِ عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اوراس تقسیم سے انسانوں میں ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے،نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے اورنہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے،بلکہ ہرروز پانچ دفعہ اس کوادا کرنا پڑتا ہے،صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آکر توڑ دیا،پھر مشغولیت ہوئی اورعصر پر پہونچ کر ختم ہوئی،پھر جو سلسلہ چھیڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا،بعدازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اورعشاء پر جاکر منتہی ہوئی،اب نیند آگئی اورصبح تک بے خبری رہی،اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا،وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت ومشقت اورمزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے،وہ اس روحانی ''انٹرول''(وقفہ)کے لطف سے آگاہ نہیں،یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا،وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھوکر دعا وتسبیح اورنشست وبرخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہوگیا اورپھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کرلی۔

۱۵۔ تربیت: انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات واخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام میں اس خُلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو، نماز ایک ایسا فریضہ ہے، جس کے بارے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان میں استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی، اس لئے قرآن پاک نے صحابہؓ کی مدح میں کہا:

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَا بِهِمْ دَآئِمُوْنَ. جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

(معارج-۷۰:۲۳)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

احب الاعمال الی اللہ ادومہ و ان قل (۱) محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔

۱۶۔ نظم جماعت: کسی قوم کی زندگی، اس کی نظمِ جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی تھی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہوجاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کرکے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت وجنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم ومضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نماز جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ صفوں کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ "جب تک خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے" (۲)

۱۷۔ مساوات: یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی درس گاہ ہے، یہاں امیر وغریب، کالے، گورے، رومی، حبشی، عرب وعجم کی کوئی تمیز نہیں ہے، سب

(۱) ابوداؤد باب مایومر به من القصد فی الصلوۃ ص۱۹۴۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الاذان باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ وبعدھا ج۱ ص۱۰۰ و ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب تسویۃ الصفوف ج۱ ص۱۹۷ اصح المطابع کلکتہ۔

ایک ساتھ، ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لئے حسب ونسب، نسل وخاندان، رنگ وروپ، قومیت وجنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم ودانش، فضل وکمال اور تقویٰ وطہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ وگدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بہ دوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی درس گاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

۱۸۔ مرکزی اطاعت: جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعت امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا امام ہے جس کے اشارے پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کارواں کے لئے بانگِ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعتِ امام کے لئے ایک طرف تو قوم میں فرماں برداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاقِ صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگوں کے پیشِ نظر رہے، نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے جو قوم کے اعضاء وجوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لئے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نماز پنج گانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش وعشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریکِ جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا، چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہؓ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی اس زمانہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے، جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

۱۹۔ معیارِ فضیلت: نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم وفضل اور تقویٰ کے کوئی اور

قید نہیں ہے، اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحبِ علم (اقرأ) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم میں سے جس کو قرآن زیادہ یاد ہو، وہ امام بنے، اتفاق یہ کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کم سن تھے، ان ہی کو قرآن زیادہ یاد تھا، چنانچہ لوگوں نے ان ہی کم سن صحابی کو اپنا امام مقرر فرمایا (۱) اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲۰۔ روزانہ کی مجلس عمومی: آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوة جامعة (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارت تھا، وہی دار الشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درس گاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلافِ باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر

(۱) سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب من احق بالامامة ج ۱ ص ۸۶۔

جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام وقائد و سرِ لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرماں برداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز ان ہی رموز واسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری وفرماں بری اور وحدتِ قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے نہ انقیادِ امامت ہے، نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعیِ اسلام علیہ السلام نے یہ فرمادیا:

العھد الذی بیننا و بینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر (۱)

ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کا کام کیا۔

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شرابِ بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

عرب کی روحانی کایا پلٹ: وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بے گانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح وتحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین وتسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی، اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں، اس کی روح یادِ الٰہی کی تڑپ اور ذکرِ الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

دل را کہ مردہ بود حیاتے زنو رسید
تابوئے از نسیمِ میش درمشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ:

(۱) مسند احمد ج ۵ ص ۳۴۶ و ترمذی ابواب الایمان باب ماجاء فی ترک الصلوٰۃ ج ۲ ص ۹۰ دیوبند، ونسائی کتاب الصلوٰۃ باب الحکم فی تارک الصلوٰۃ ج ۱ ص ۵۴ و ابن ماجہ ابواب اقامۃ الصلوٰۃ باب ماجاء فی من ترک الصلوٰۃ ص ۱۷۲ اعمدۃ المطابع دہلی۔

وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا. (نساء:۴-۱۴۲) اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

دعوتِ حق اور فیضِ نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان کر دی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کر سکیں:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور:۲۴-۳۷) ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔

اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بے قراری تھی:

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آلِ عمران:۳-۱۹۱) جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں۔

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سر بہ سجود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (سجدہ:۳۲-۱۶) جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے علاحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

وہ جن کا یہ حال تھا:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝ (مرسلات:۷۷-۴۸) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ:

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (فتح:۴۸-۲۹) تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (زمر:۳۹-۴۵) اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، مکدر ہو جاتے ہیں۔

آفتابِ نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیتِ الٰہی کا یہ جوہر پیدا کر دیا:

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (انفال:۸-۲ و حج:۲۲-۳۵) وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کے یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہؓ) خرید وفروخت اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا، تو یہ شغل وعمل ان کو یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے، (۱) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دوکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ (۲)

صحابہؓ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے، خدا نے گواہی دی:

اِنَّ رَبَّکَ یَعۡلَمُ اَنَّکَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰی مِنۡ ثُلُثَیِ الَّیۡلِ وَنِصۡفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَکَ (مزمل:۷۳-۲۰)	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور ایک تہائی رات تک کھڑا رہتا ہے، تیرے ساتھ کی ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہؓ کو راتوں کے سوا خدا کو یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے اس والہانہ اندازِ عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے:

وَتَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ . الَّذِیۡ یَرٰکَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ. وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیۡنَ. (شعرا:۲۶-۲۱۷ تا ۲۱۹)	اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔

مدینہ منورہ میں آ کر سب سے پہلا فقرہ جو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا:

یاایھا الناس اطعموا الطعام وافشوا السلام وصلوا والناس نیام (۳)	اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب البیوع باب التجارۃ فی البر مرسلاً ج۱ص۲۷۷ صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں باب التجارۃ فی البز بھی ہے۔ ''ض''۔ (۲) فتح الباری ج۴ص۲۵۳ بحوالہ عبدالرزاق۔ (۳) ترمذی، ابواب صفة القيامة باب ج۲ص۷۵۔

بعض صحابہؓ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انھوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا، آخر آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''عثمان! تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی'' (۱) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے (۲) حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے، ایک میں خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ (۳)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی (۴) حضرت ابودرداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے، حضرت سلمان فارسیؓ ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر سوئے، جب رات کو حضرت ابودرداءؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا، پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے (۵) کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو، یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے ایک پُر خطر کام کے لئے کہیں بھیجا تھا، جب وہ منزلِ مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے، تو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے تھے اور چلتے جاتے تھے (۶) سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے (۷)

---

(۱) ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ابواب قیام اللیل باب مایومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ ص۱۹۴۔ (۲) ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ابواب قیام اللیل باب نسخ قیام اللیل و التیسیر ص۱۸۵۔ (۳) صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الحشف ج۲ص۸۱۸۔ (۴) بخاری کتاب الصوم باب حق الجسم فی الصوم و باب صوم الدھر ج۱ص۲۶۵۔ (۵) ایضاً باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع ج۱ص۲۶۴۔ (۶) ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ الطالب ص۱۷۸۔ (۷) نسائی کتاب الامامۃ باب المحافظۃ علی الصلوٰۃ حیث ینادی بھن ج۱ص۹۸ دیوبند۔

پھر وہ جس خضوع وخشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، اس کا نظارہ بڑا پُر اثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا(۱) حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی (۲) حضرت تمیم داریؓ ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کردی، بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔(۳)

شب شود صبح و ہماں محو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے تھے کہ کچھ بھول گئے ہیں (۴) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطحِ جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔(۵)

ایک رات میدانِ جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے، جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون میں تر بہ تر ہو جاتے ہیں، مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں، ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے مجھے اس وقت کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے، میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں (۶)۔

اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیروں کا مینھ برس

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاذان باب اذا بکی الامام فی الصلوٰۃ ج۱ص۹۹ (مگر مصنف نے جو روایت نقل کی ہے وہ کتاب الصلوٰۃ باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ضرر (ج۱ص۶۸) اور باب ھجرۃ النبی واصحابہ الی المدینۃ (ج۱ص۵۵۲، ۵۵۳) کے الفاظ ہیں)۔ ''ض'' (۲) ایضاً کتاب الصلوٰۃ باب المسجد یکون فی الطریق (مگر حضرت عمرؓ کا ذکر کتاب الاذان باب اذا بکی الامام میں ہے ج۱ص۹۹) ''ض''۔(۳) اسد الغابہ تذکرہ حضرت تمیم داریؓ ج۱ص۲۱۵ جمعیۃ المعارف ۱۲۸۴ھ۔ (۴) صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین ج۱ص۱۱۳۔(۵) حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصابہ ج۴ص۷۰ مصر ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء واسد الغابہ ج۳ص۱۶۲ وغیرہ۔(۶) ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب الوضوء من الدم ص۲۶۔

برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوندرہی ہیں، سروگردن، دست وبازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں، اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت اور حیات سے بے پرواہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظمؓ امامِ نماز ہے، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں، دفعتاً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے، آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں، خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفۂ وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔(۱)

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا، اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لئے جگایا، تو بولے "ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں" چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی۔(۲)

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں (۳) ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہیں، امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں، عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیا آپ کو نرغہ میں لئے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ "وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کرسکیں"۔(۴)

نماز میں جس خضوع وخشوع کا حکم ہے، صحابہ کرامؓ نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق وشوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا، حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوش نما چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا شروع کیا، حضرت طلحہؓ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو

(۱) صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب عثمان باب قصة البيعة والاتفاق علی عثمان بن عفان ج ۱ ص ۵۲۳۔

(۲) مؤطا امام مالک کتاب الصلوٰة العمل فی من غلب علیه الدم ص ۱۳۔(۳) الریاض النضرة فی مناقب العشرة للمحب الطبری ج ۲ ص ۲۴۶۔(۴) تاریخ طبری کبیر ج ۷ ص ۳۴۷ و ۳۴۸ واقعات ۶۱ھ۔

رکعت یاد نہ رہی، دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا؛ اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ باغ راہِ خدا میں نذر ہے۔(۱)

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے، باغ اس وقت نہایت سرسبز وشاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا، پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال ودولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا راہِ خدا میں دیتا ہوں، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔(۲)

---

(۱) و (۲) یہ دونوں واقعے مؤطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب النظر فی الصلوٰۃ الی مایشغلک عنها میں مذکور ہیں۔ ص ۳۴ و ۳۵۔

زکوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (بقرہ:۲-۸۳)

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم: نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق ومخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظامِ جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے، جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہم دردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے، اور جس کا فائدہ نظامِ جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے، لیکن فقہی اصطلاح میں ''زکوٰۃ'' صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں: زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے، لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بہ ظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا، حالاں کہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزء لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جز رہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں:

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (بقرہ:۲-۸۳) — (ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار کرلیا تھا کہ) کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ۔

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ (مائدہ:۵-۱۲) — (اے بنی اسرائیل!) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔

حضرت اسماعیلؑ کے ذکر میں ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا. وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا
(مریم ۱۹: ۵۴و۵۵)

اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شک وہ وعدہ کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں:

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا.
(مریم:۱۹-۳۱)

اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی۔

توراۃ سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار۔۲۷۔۳۰۔۳۲ العہد القدیم ص ۲۰۵) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ وہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا (خروج۔۳۰۔۱۳۔۱۵ العہد القدیم ص ۱۳۷) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارونؑ کی اولاد (لاوین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا (۱) اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا (۲) اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی۔(۳)

حضرت عیسیٰؑ نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل لوقا (۱۸۔۱۰ العہد الجدید) میں ہے کہ ''جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش اور فخر کے لئے دیتا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے'' اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت (ص ۱۳۵) میں ہے:

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''خیرات'' (CHARITY) باب یہودیوں میں ''خیرات'' (۲) توراۃ: خروج ۳۰-۱۶ العہد القدیم ص ۱۳۷ و ۳۸-۲۶ ص ۱۵۳۔ (۳) توراۃ: خروج ۳۰-۱۶ العہد القدیم ص ۱۳۷ و ۳۸-۲۶ ص ۱۵۳۔

''اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوصِ دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولت مند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے''۔

حضرت عیسیٰؑ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے کہ:

''اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے، مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے'' (متی ۱۹۔۲۴ العہد الجدید ص ۳۵)

ساتھ ہی انھوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ (متی ۱۷۔ص ۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی، اس لئے ان ہی دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی، اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی، علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے، یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے، اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ. (بقرہ: ۲-۸۳)	(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کرسکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی، جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہوسکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل: محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا، اس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا، چاندی اور جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ شرحیں مقرر کیں، سونے چاندی میں چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا، جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں، پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعتِ محمدی ﷺ کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت: اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفۂ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوقِ الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں، ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوقِ عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے، قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اَقَامَ الصَّلٰوۃَ کے بعد ہی اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃَ آیا ہے، مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے، بارگاہِ نبوی ﷺ میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپ ﷺ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں، جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائطِ بیعت میں داخل کی گئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت تین باتوں پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا" (۱) وفد عبدالقیس نے ۵ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں پہلے

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب البیعۃ علی ایتاء الزکوٰۃ ج ا ص ۱۸۸۔

نماز، پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔(۱)

۹ رہجری میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ ’’پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لیں، تو انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔(۲)

صحابہ میں جو لوگ شریعت کے رازداں تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہلِ عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے‘‘ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، ’’خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا‘‘(۳) حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرمِ اسرار سمجھ سکتا تھا (۴) اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظامِ روحانی نمازِ باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو قائم ہوتا ہے، اور نظامِ مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸ (۲) صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجھمیۃ باب ماجاء فی دعاء النبی ﷺ امتہ الی توحید اللہ (۳) صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸۔ (۴) درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرزِ عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ .... فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (توبہ: ۹-۵) ’’ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ.......... تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دے دو‘‘ نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۹۶ کتاب الاعتصام باب قول اللہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔

کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعتِ محمدی ﷺ نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے، مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں، یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے، بلکہ بہ طور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعتِ محمدی ﷺ کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بہ زور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا کہ اگر ان کی بات تسلیم کر لی جاتی، تو اسلام کی وحدت کا سر رشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے، جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل: جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتحِ مکہ کے بعد قائم ہوا، بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالاں کہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مرادف تھا، اس کی مقدار، نصاب، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں، محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہرِ اعظم ''نماز'' اور دوسرے کا ''زکوٰۃ'' ہے، اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غارِ حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے، اسی طرح بے کس اور لاچار انسانوں کی دست گیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ نے بعثت کے وقت آپ ﷺ کی نسبت فرمایا ''آپ ﷺ قرابت داروں کا حق پورا کرتے ہیں، قرض داروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کماتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کو مصیبتوں

میں مدد دیتے ہیں'' (۱) غور کیجئے کیا زکوٰۃ ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ تو اُم ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں، جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکامِ اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اس میں نماز کی تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے:

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. (مدثر:۷۴-۳) اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے، جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد:

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ. (مدثر:۷۴-۶) اور بدلا بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائلِ زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری، اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا (مزمل:۷۳-۲۰)

اور نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو، اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے، اس میں ہے ''اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں'' (۲) اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی (۳) ۶ھ میں جب نجاشی کا نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے، اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انھوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ کا بھی تذکرہ کیا (۴) ان واقعات سے بہ خوبی واضح

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۔ (۲) مسند احمد جلد اول ص ۲۰۲۔ (۳) صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ ج ۱ ص ۱۸۸۔ (۴) صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ باب وجوب الزکوٰۃ ص ۱۸۷ و کتاب التفسیر۔

ہے کہ ۸ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقۂ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کار بند بنانا تھا، اس لئے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزا اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی ہے، مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی، اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں، چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کی خیرات کی تعلیم دی گئی:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ . فَكُّ رَقَبَةٍ. اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ. يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ . اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ. (بلد: ۹۰-۱۲ تا ۱۵)

اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی (قرض دار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو، یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

عام قریش پر جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا، عتاب آیا:

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ . وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (ماعون: ۱۰۷-۲ و ۳)

وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ . وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (فجر: ۸۹-۱۷ و ۱۸)

یہ بات نہیں، بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔

اور مسلمانوں کے اخلاص، باہمی ہمدردی اور ان کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی کہ:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا. اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا. (دھر: ۷۶-۸ و ۹)

اور وہ (حاجت مند ہونے کے باوجود) محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو صرف خدا کے لئے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں، نہ شکریہ۔

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انھوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا (۱) یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے

(۱) تاریخ طبری طبع یورپ ج ۳ ص ۱۲۸۱۔

دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذاریں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی، انھوں نے دریافت کیا، یارسول اللہ ﷺ! ہم کیا خیرات کریں:

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (بقرہ:۲-۲۱۹) وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔

ارشاد ہوا:

قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ:۲-۲۱۹) کہہ دو (اے پیغمبر!) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے، صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں، آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں (۱) کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (بقرہ:۲-۲۶۷) اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ. (بقرہ:۲-۳) اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے، تو غریب و نادار صحابہؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے، انھوں نے پھر گذارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجت مند کی

---

(۱) کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکاتہ فلیس بکنز ج ۱ ص ۱۸۸ مع فتح الباری ج ۳ ص ۲۱۶۔

مدد کرے، انھوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا "تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے(۱)" آنحضرت ﷺ کی ان پُر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہؓ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا، اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔(۲)

لیکن بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا، اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان ۸ ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سر رشتہ میں منسلک کر دیا، اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ: ۹-۱۰۳)

(اے محمد رسول اللہ ﷺ!) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کر سکو۔

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ ہجری میں زکوٰۃ کے تمام احکام وقوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا(۳) اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام وقوانین سورۂ برأت میں مذکور ہیں، جو ۸ ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین: اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط وتفریط تھی، توراۃ میں عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا، (استثنا ۱۴۔۲۸ ص ۲۰۳) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا، کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے، اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں، مسکینوں اور قابلِ امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیوں کہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے

(۱) صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب علی کل مسلم صدقة الخ ج ۱ ص ۱۹۴۔ (۲) صحیح بخاری باب اتقوا النار ولو بشق تمرة ج ۱ ص ۱۹۰۔ (۳) ابن سعد جلد مغازی جز ثانی قسم اول ص ۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۳ ص ۱۷۲۲ مطبوعہ یورپ۔

بارہ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصل سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیوپار کرنا ہے، آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف گذر جائیں تا کہ پورے سال کے آمد وخرچ اور نفع ونقصان کی میزان لگ سکے اور زمین دار، کاشت کار، تاجر، نوکر، صناع ہر ایک اپنی آمدنی وسرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے، بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے(۱) ان تمام وجوہ سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعتِ محمدی ﷺ نے بھی اس بارہ میں اسی طبیعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے، چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۂ توبہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں، زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں، جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

(توبہ:۹-۳۶)

زکوٰۃ کی مقدار: توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار، پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر وغریب سب پر یکساں فرض تھا لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا، انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعتِ کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹیکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعتِ محمدی ﷺ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم وبیش

(۱) بکری کی مدت حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہے۔

جو چاہے خدا کی راہ میں دے دے، اس کا نام انفاق یا عام خیرات وصدقہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ . وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ . لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگتے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔

(معارج: ۷۰-۲۳ تا ۲۵)

اس آیت سے صاف اور صریح طریقہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے، وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے، چنانچہ قرآن پاک میں معلوم اور معلومات کے الفاظ جہاں آئے، وہاں یہی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا، عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے، یعنی پیداوار میں دسواں حصہ اور نقد میں نصف مثقال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمتِ ربانی سے اجناسِ زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی ''شرح معلوم'' کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوینِ حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتبِ حدیث میں درج کیا گیا، جو آج تک موجود ہے۔

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو، ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا مگر چوں کہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدنظر تھی، اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ (۱/۴) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار

پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کرسکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "خُمس" ہے قرآن نے کہا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے، اس کا پانچواں حصہ
وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ	خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مند کے لئے
وَابْنِ السَّبِیْلِ (انفال:۸-۴۱)	اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے۔

نکتہ: اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں، اور اگر کوئی صرف حصولِ غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے، تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا، اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے، اور آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے، اس بناپر درحقیقت وہ مالِ غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے، جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظامِ جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلاکسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بناپر "رکاز" یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا زحمت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے، خمس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا، شریعتِ محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرحِ زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی، جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں تاکہ ان سے حسبِ منشا خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بناپر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو دو ایک روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں، کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی

صلاحیت نہیں، مثلاً آلاتِ مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری اور قیمتی پتھر(۱) ان پر زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں، پیداوار، زمین، جانور، سونا چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشت کار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے ان کے سیراب کرنے میں کاشت کار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱/۱۰) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشت کار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو، مثلاً کنویں سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ (۱/۲۰) مقرر ہوا، نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس میں ہر قدم پر

(۱) قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے، فرمایا حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا (نحل: ۱۶-۱۴ و ملائکہ: ۳۵-۱۲) زیور جن کو تم پہنتے ہو۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض فقہاء کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسبابِ زینت میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کرلے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو تجارت کے لئے ہے، تو ان پر مالِ تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، یہ کہ کوئی بد نصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لئے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی لیکن دیانتاً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گنہ گار ہوگا اور تیسری صورت یہ کہ وہ محض سامانِ تعیش اور فخر و مباہات کے لئے جمع کرتا ہے تو اس کی حالت وہی ہوگی جو بیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کرلے، اس کا شمار اسراف میں ہوگا اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریاتِ زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریاتِ زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کی جاتی ہے، چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی یا وہ ٹوٹ جائیں یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی بہ خلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے اور وہ ضروریاتِ زندگی کے لئے زرِ مبادلہ ہے، وہ ٹوٹ بھی جائے یا میلا بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے اور اسی لئے وہ معیارِ زر ہیں۔

چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں (۱/۴۰) حصہ مقرر ہوا (۱) (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے۔)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی وبیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہِ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوجاتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے، وہ براہِ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید وفروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشت کاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں، جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلاب کے بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشت کار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہے، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں، اس لئے نسبتاً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس ''انفاق'' یعنی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں، جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہلِ زمین سے مختلف رکھی جائے۔

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خُمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ''خمس'' میں چونکہ امامت وحکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہیں، اس لئے وہ کل کا ''خمس'' یعنی ۱/۵ مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ آیت ۶۰ میں مذکور ہیں، صرف آٹھ ہیں، اس بنا پر آٹھ مصارف کی شرح مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ حصہ (یعنی ۱/۴۰) مقرر ہوا، یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں ان آٹھ مصرفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان دوسو درموں کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے، تو ۴۰ ہو جائے گا، یہ کل زکوٰۃ

---

(۱) یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد (ج ۱ ص ۱۵۲ مطبع میمنیہ مصر) میں بیان کیا ہے۔

کی شرحیں ۵/او۱۰/۱، او۲۰/۱، او۴۰/۱ ایک دوسرے کا نصف کا یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانوروں پر زکوٰۃ: توراۃ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ (۱) کا تھا، لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدتِ افزائش (زمانۂ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع اور تعداد پر چسپاں نہیں ہوسکتا، اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعتِ محمدیہ ﷺ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت، کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کردیا، مثلاً خچر گھوڑے (۲) (یا ہندوستان میں ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہیں، دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت وکیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمتِ ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں، بلکہ فرامین کی صورت لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا، خلفائے راشدینؓ نے اسی کی نقلیں حدودِ حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری
اونٹ	۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکریاں
اونٹ	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں
اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
اونٹ	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سالہ بچہ
اونٹ	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دوسالہ بچہ
اونٹ	۴۶ سے ۶۰ تک	تین سال کا اونٹ کا بچہ
اونٹ	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ

(۱) احبار: ۲۷-۳۳-العہد القدیم ص ۲۰۵۔ (۲) حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے
اونٹ	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے
اونٹ	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ
اونٹ	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں
بکری	۴۰ سے ۱۲۰ تک	ایک بکری
بکری	۱۲۱ سے ۲۰۰ تک	دو بکریاں
بکری	۲۰۱ سے ۳۰۰ تک	تین بکریاں
بکری	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری
گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں
گائے، بیل، بھینس	۳۰	ایک دو سالہ (۱) بچھڑا
گائے، بیل، بھینس	۴۰	تین سال (۲) کا ایک بچھڑا
گائے، بیل، بھینس	۶۰	دو سال کے دو بچھڑے
گائے، بیل، بھینس	۷۰	ایک تین سال اور ایک دو سال کا
گائے، بیل، بھینس	۸۰	تین سال کے دو
گائے، بیل، بھینس	۹۰	تین سال کے تین
گائے، بیل، بھینس	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک

غرض اصول یہ ہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ۔

نصابِ مال کی تعیین: شرحِ زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائعِ سابقہ میں ایک اور کمی تھی، جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے کردی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے، ان میں امیر و غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بیس روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی، تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ میں غلہ

(۱) یعنی جس کا دوسرا سال شروع ہو۔ (۲) جس کا تیسرا سال شروع ہو۔

اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ:

''خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے'' (خروج ۳۰۔۱۵ العہد القدیم ص ۱۳۷)

لیکن شریعتِ محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے، یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ وہی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائے گا، جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال سونے (۱) کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درم چاندی کے سکے ہیں، یعنی ایک اوقیہ چالیس درم کے برابر ہے (۲) وہ کم سے کم معیارِ دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے:

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ (۳) وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں
اونٹ	پانچ عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
گائے، بیل، بھینس	۳۰ عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
بھیڑ، بکری	۴۰ عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی، وہ دور ہوگئی، اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے۔

(۱) موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولہ کے اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپے (تولے) کے برابر ہے (مگر یہ کتاب کی تصنیف کے وقت انگریزی دور کے لحاظ سے ہے، اب ایک تولہ یعنی انگریزی سکہ تقریباً سو روپے کے برابر ہے، اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے)۔ (۲) سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوٰۃ وحد الغنیٰ جلد اول ص ۱۶۴، اصح المطابع لکھنؤ۔ (۳) ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو۔

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں، پانچ وسق غلہ، دوسو درم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا در حقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا، چالیس درم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دوسو درم برابر ہیں، اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس درم (۱) یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دوسو درم یا ۲۰ مثقال ہوگی۔

زکوٰۃ کے مصارف اوران میں اصلاحات: حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی، یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر ومرمت اور قربانی کے طلائی ونقرئی ظروف وسامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی، (خروج ۳۰-۱۳-العہد القدیم ص ۱۳۷) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابہ جا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں، وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا (احبار ۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل وعیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے اور لاویوں میں جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گذار ہیں، نام بہ نام تقسیم کیا جائے اور (اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں، یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے (استثناء ۱۴:۲۶ سے ۲۹ تک العہد القدیم ۳۰۲)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی:

۱- وہ عبادات میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بے کار تھا، کلیتاً اڑ گیا۔

۲- عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمایشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمع دانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳- حج ان ہی پر واجب کیا گیا، جن کے پاس زادِ راہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ

---

(۱) ہدایہ باب الزکوٰۃ فی التجارۃ فصل فی العروض ج ۱ ص ۸۰ مطبع خیریہ ۱۳۲۶ھ۔

جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

۴- زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کردی گئی کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی، تو اس میں ایثار کیا ہوا۔

۵- اس طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مدوں سے بچیں، غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں۔

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ ﷺ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں۔

۶- شریعتِ سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ذخیرہ میں جمع ہوکر، اس کا کھانا پک کر غربا میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں، اس لئے شریعتِ محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے، تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

۷- ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعتِ محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

۸- غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہاں یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہوسکتا ہو، مگر ایک عالم گیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹- بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے، جب تک ان کو امداد ملتی رہتی، خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن وطنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگوں کا منھ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کردی اور بتادیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کے آٹھویں رکوع آیت ۶۰ میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

۱۰- اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتادیئے

جاتے تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش وعشرت کے پُرتکلف سامانوں کے نذر ہو جاتا، اس لئے تاکید کردی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا، تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تابہ امکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱- اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے، تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوسکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد (بنو لاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت ﷺ نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام کردی۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ۔ (توبہ:۹-۶۰)	زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں اور زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لئے ہے، جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں، ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں، یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے اور خدا جاننے والا، حکمت والا ہے۔

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفاء کو ترجیح دی ہے، جو دین اور مسلمانوں کے لئے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کرسکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ:۲-۲۷۳)	ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں تم ان کو ان کے چہرے سے پہچانتے ہو کہ وہ حاجت مند ہیں لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

تمام مستحقین کو درجہ بہ درجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے، چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ (بقرہ:۲-۱۷۷)	اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (بقرہ:۲-۲۱۵)	کہو جو تم مال خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لئے۔

دو ضرورت مندوں میں ترجیح: اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی، بے گانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خودغرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں، اور ان کا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں، وہ تمام تر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہیں، جو جتنا قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہوجائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل وعیال کا، ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ رہے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اسی اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے، تو کل انسانوں کی خبر گیری ہوجائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے، جس کو دور ہوجانا چاہئے، مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزوں پر ہے، ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب وبعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی وبیشی، قرابت مندوں کی ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی

ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے، جن کی ضرورت اور حاجت مندی ان سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہم سایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب، اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔

فقراء اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ در بہ در بھیک مانگتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے، جو فقر وفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عزت وآبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ''مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے در بہ در پھرایا کرتے ہیں'' صحابہؓ نے دریافت کیا، پھر کون مسکین ہے، ارشاد ہوا ''وہ جس کی حاجت ہے، لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں''۔(۱)

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہئے جو صبر وقناعت کے ساتھ فقر وفاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہوسکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کردے کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔

شریعت نے مصارفِ زکوٰۃ کی تعیین وتحدید اس غرض سے بھی کی ہے تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس وناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے جیسا کہ بعض منافقین اور اہلِ بادیہ نے اس کو اپنے ایمان واسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحیِ الٰہی نے ان کی پردہ دری ان الفاظ میں کی:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا	اور بعضے ان میں سے ایسے ہیں، جو تجھ کو (پیغمبر کو) زکوٰۃ
مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا اِذَا هُمْ	بانٹنے میں طعن دیتے ہیں، اگر ان کو اس میں سے ملے تو

(۱) صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ فتصدق علیہ ج ۱ ص ۳۸۲۔

يَسْخَطُوْنَ . وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ . اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ

(توبہ:۹-۵۸تا۶۰)

راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں، اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے ہیں کہ ہم کو اللہ بس ہے، ہم کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے رہیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہئے، زکوٰۃ تو حق ہے، غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کرنے والوں کا، اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پر چانا ہے اور گردن چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں ان کا، اور خدا کی راہ میں اور مسافر میں، یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی، آپ ﷺ نے فرمایا ''اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں (۱)''۔

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشت گانہ: یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہلِ حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، جیسے بوڑھے، لولے، لنگڑے، مفلوج، کوڑھی یا وہ جو محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ (بقرہ:۲-۲۷۳) میں اسی طرح داخل ہیں، جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانۂ مبارک میں اصحابِ صفہ داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں، جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے اور فاقہ کرتے ہیں۔

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا ، یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی

(۱) ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی ج۱ ص۱۶۴۔

اس میں سے اپنے کام کی اجرت پاسکتے ہیں، اور وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (جن کی تالیفِ قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے، وَفِي الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں، جن کی گردنیں، دوسروں کے قبضہ میں ہیں، اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے اور وہ مقروض ہیں، جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کرسکتے۔ وَالْغَارِمِينَ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جاسکتی ہے، وَفِي سَبِيلِ اللهِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے، جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے (۱) اور حسبِ ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفرِ حج، یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جاسکتے ہیں اور وَابْنَ السَّبِيلِ (مسافر) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہوسکتی ہے (۲) یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد: زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے، نادار یتیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جد وجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کرپاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابلِ افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہیں، جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

---

(۱) اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ (بقرہ-۲:۲۷۳) یہاں فِي سَبِيلِ اللهِ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَاءِ کے لامِ تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے، ہوسکتا ہے کہ لامِ انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (۲) کتاب الخراج قاضی ابو یوسف فصل فی الصدقات باب فی النقصان والزیادۃ والضیاع ص ۴۶ مطبع میریہ مصر ۱۳۰۲ھ ہجری۔

غلامی کا انسداد: غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسنِ سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرِفدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آسکتی، پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقے کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرادی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہوجائیں، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہوجائے۔

مسافر: گذشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسافروں کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل وذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی، صحرا اور بیابان، جنگل اور میدان، آبادی اور ویرانی، ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل وعیال، عزیز وقریب، دوست واحباب، مال ودولت سے الگ ہوکر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں، ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آجاتی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے آرام وآسایش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانۂ کہن اور داستانِ پارینہ ہوگئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے بڑے بینک اور آمد ورفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں اور سفر وحضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے، یہ صرف دولت مندوں اور سرمایہ داروں کی راحت وآسایش کے لئے

ہوا ہے، اوران کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پُر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولت مند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں، کسی کی جیب میں جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چک نہیں اس کے لیے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں، کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول وعرض میں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کے قبضہ میں آئے، سراؤں، مسافر خانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارے سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام وآسایش پہنچ جاتا تھا اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اھلا باھل و اوطانا باوطان کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا اور آج بھی اس نظام کی بدولت جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور طریق سے واقف نہیں ہیں، غریب مسافروں کو وہی آرام وآسایش ہے اور امراء اور دولت مندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق:

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت: جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں، جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد ورفت اور سفر کے وسائل کی ترقی وتعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا، جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجالائیں اور اس رقم کی فراہمی اور نظم ونسق کے فرائض انجام دیں، زکوٰۃ اسی نظامِ جماعت کا سرمایۂ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد فوائد، اصلاحات: زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ زکوٰۃ کے معنی کے اندر ہے، زکوٰۃ کے لغوی معنی ''پاکی'' اور ''صفائی'' کے ہیں، یعنی گناہ اور

دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس میں ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا. وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا. (شمس: ۹۱-۹و۱۰)

مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔

ایک اور سورہ میں ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی. (اعلیٰ: ۸۷-۱۴)

مراد پایا وہ جو پاک وصاف ہوا۔

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں ہے(۱):

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ (بقرہ: ۲-۱۲۹ و جمعہ: ۶۲-۲)

وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

تزکیۂ نفس: ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعتِ محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے، انسانوں کی روحانی ونفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے، لیکن دوسرا سبب ماسوئ اللہ کی محبت اور مال ودولت اور دیگر اسبابِ دنیا سے دل کا تعلق ہے، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی، غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا (توبہ: ۹-۱۰۳)

ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے، دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل

(۱) الفاظ سورہ بقرہ کے ہیں ’’ض‘‘۔

کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، شخصی خودغرضی کے بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں، جن پر تہذیبِ نفس اور حسنِ خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے:

يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ — خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔

(بقرہ:۲-۲۷۶)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے، لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے، جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ وعطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں، وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بہ یک وقت قبضہ کر لیتا ہے، لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویریں ہیں، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے کہ تمام اخلاقی محاسن کا سنگِ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہایت بلیغ

وحکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنی عن کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس (۱) تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے، ''تونگری بدل ست، نہ بہ مال'' دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص وطمع سے نہیں، بلکہ صبر وقناعت کے بہ دولت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ وصدقہ کے مطہر، مزکی اور مصلحِ اخلاق ہونے میں شبہہ ہوسکتا ہے؟

سود خوار کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت میں فائدہ اٹھائے، لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں، تاکہ وہ اپنے مال ودولت سے اس کی مدد کر کے اس کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکیں۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر: زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے، جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہلِ مذہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہوسکتی، محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں، جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر، آپ ﷺ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ ﷺ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے، آپ ﷺ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، اور نہ دولت وامارت عزت اور وقار کے مرادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت اور بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیوں کہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے (۲) آنحضرت ﷺ نے اس سے زیادہ اختصار وایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا:

---

(۱) بخاری کتاب الرقاق باب الغنی غنی النفس ج ۲ ص ۹۵۴۔ (۲) متی ۵-۳ العہد الجدید ص ۷۔

المکثرین هم المقلون (۱) جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے، پھر انہیں خوش خبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔(۲)

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں، جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب وتشویق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی، جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے، لیکن چوں کہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی، اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا، جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد واعانت کے لئے مخصوص کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابلِ تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے، پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ:

تؤخذ من اغنیائهم وترد علیٰ فقرائهم (۳) وہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔

صحابہؓ نے آپ ﷺ کی ہدایت کے بہ موجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بھی بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے، وہ غریب ومعذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ ﷺ نے یہاں تک اس طبقہ کی دل جوئی کی کہ فرمایا ''اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف ومہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے'' اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون هم المقلون ج۲ص۹۵۳۔(۲) جامع ترمذی کتاب الزهد باب ماجاء ان فقراء المهاجرین یدخلون الجنة قبل اغنیائهم ج۲ص۶۱۔(۳) صحیح بخاری جلد دوم ص۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجهمیة باب ماجاء فی دعاء النبی امته الی توحید الله۔

فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْھَرْ. وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ.　تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔

(ضحیٰ:۹۳-۹و۱۰)

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا، فرمایا:

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی　تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو۔

(بقرہ:۲-۲۶۴)

اس لطف، اس مدارات اور اس دل جوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابلِ رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا یا سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہوسکتا، اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب محتاج بھی کم ہیں، جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی طرف سے غفلت برتی جارہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولت مندی کی بیماریوں کا علاج: دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذاہب ہیں جن میں نہ تو دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی اور غربت کو سراہا گیا ہے، بلکہ گویا اس بحث کو نا منفصل چھوڑ دیا گیا، لیکن عیسائیت اور بودھ مت، دو ایسے مذہب ہیں، جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے، عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول، نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پاسکتا، جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے، خدا کی راہ میں لٹا نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولت مند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

”اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے، بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا، تب آکے میرے پیچھے ہولے“۔

وہ دولت مند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو'' (متی ۱۹-۲۱-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے، اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی، اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانش مندی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے، نہ نفسِ دولت فرشتہ کو شیطان اور اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے، اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کا بچانا ایک نبوت عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک وبد اور خیر وشر دونوں صفتوں سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولت مند ایک نیکوکار غریب سے بہ درجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے، لعنت نہیں، ہنر ہے، عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں، چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو ''خیر'' اور ''فضل'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال واسباب خدا کی راہ میں دیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم اہل وعیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں'' (۱) آپ ﷺ کے حلقہ بگوشوں میں دولت مند بھی تھے اور غریب بھی اور دونوں آپ ﷺ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبوں نے آکر عرض کی

(۱) بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس ج۱ص ۳۸۳۔

کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کر پاتے، آپ ﷺ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولت مند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے، غریبوں نے پھر جا کر عرض کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ خدا کا فضل ہے، جس کو چاہے دے''۔(۱)

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا، اپنی روشن تعلیم کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا، ایک دفعہ آپ ﷺ نے تقریر میں فرمایا کہ ''لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے'' صحابہؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ ﷺ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ ﷺ کا کیا مقصود ہے'' فرمایا ''دنیا کا باغ و بہار (عیش ونشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟'' سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے، وہ فتنہ کیوں کر ہو سکتی ہے، آپ ﷺ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے، پھر فرمایا ''بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسمِ بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص وطمع میں آکر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوش گوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا''۔(۲)

اس تقریر میں آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفسِ دولت خیر و شر نہیں ہے، بلکہ اس کا درست و نادرست طریقۂ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الاذان باب الذکر بعد الصلوٰۃ ج۱ص۱۱۶ و کتاب الدعوات باب الدعاء بعد الصلوٰۃ ج۲ص۹۳۷ و صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ ج۱ص۲۲۳۔

(۲) صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ علی الیتامیٰ ج۱ص۱۹۸ و کتاب الزھد و الرقاق باب مایحذر من زھرۃ الدنیا ج۲ص۹۵۱۔

درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے اور اگر اس کے حصول وصرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شرانگیز ہے، اخلاقی محاسن ومعائب امیر وغریب دونوں کے لئے یکساں ہیں، ایک سخی وفیاض ومتواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر وشاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک متکبر، بخیل اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امرا اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دست گیری کے ساتھ ان کے اخلاق وعادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دوطرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے سب سے پہلے حصولِ دولت کے ناجائز طریقوں، دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ ''سود'' کو حرامِ مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یوں ہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد وسیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا ''زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے، وہ اسی کی ہے'' (۱) میت کی متروکہ جائداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بہ قدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا، ممالک مفتوحہ کو امیرِ اسلام کی شخصی ملکیت نہیں بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امرا اور دولت مندوں کے بہ جائے خالص غریبوں و بے کسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (حشر:۵۹-۷)	بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگادے، وہ خدا اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ الٹ پھر کر تم میں سے دولت مندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔

(۱) مسند ابوداؤد طیالسی الجزء السادس ص ۲۰۴ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو، اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا:

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (حشر:۵۹-۹)

اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی یہ دولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دل عزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام وراحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا:

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد:۴۷-۳۸)

اور جو بخل کرتا ہے، وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیتِ پاک میں دردِ پردہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو، درحقیقت تمہاری نہیں، اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے، اور اس کی اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، کیا خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے، اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، اس آیتِ پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا:

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (تکاثر:۱۰۲-۸)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تنبیہ کی:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ. ۟الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ. يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ. (ھمزہ:۱۰۴-۱تا۳)

برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب چنتا ہو اور مال کو سینت کر رکھتا ہو، اور اس کو گن گن کر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہے گا، ہرگز نہیں۔

فرمایا "رشک" کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے، ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے، اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے (۱)" جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہیں اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (توبہ:۹-۳۴)	وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس آیتِ پاک نے صحابہؓ میں دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہئے، ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں، لیکن اہلِ راز صحابہؓ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی، حضرت موسیٰ کی تورات میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے، یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں، لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے، مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے، ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی، یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحبِ نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے، اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت

(۱) بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ ج ۱ ص ۱۷۔

انسانوں کواس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جوکل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابوذرؓ (۱) اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لاکر ڈال دیتے تھے، جیسے حضرت ابوبکرؓ (۲) اور ایسے بھی تھے، جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بہ یک وقت لٹادیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ (۳) اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے، اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور بعض انصار کرام، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّأَسِيرًا. (دھر:۷۶-۸)	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر:۵۹-۹)	اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ وہ خود حاجت مند ہوں۔

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہمیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہلِ حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبۂ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کردی ہے، اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کردی ہیں، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپروں سے اڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

وایں طائفہ جان و مال در باختہ اند و باہیچ کس ما سوا اللہ نہ پرداختہ اند، گفتۂ ایشاں است الفقیر مالہ مباح ودمہ ھدر یعنی درویش صادق آں بود کہ بخون و مال او را دعویٰ نہ بود ......اگر مالش برند خوش گردد گوید الحمد للہ کہ حجابے از پیش	اس فرقہ نے اپنی جان و مال کو ہار دیا ہے، اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا، اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو، اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو......اگر لوگ اس کا مال اٹھالے جائیں تو

(۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکوٰۃ فلیس بکنز۔ (۲) ترمذی کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ ج ۲ ص ۲۰۷۔ (۳) اسد الغابہ جلد ۳ ص ۳۱۶۔

من برداشتند تا گفتہ اند، زکوٰۃ نعمتِ دنیا نزدیکِ ایں طائفہ محمود نہ باشد از آنکہ بخل ناستودہ است و بخلی تمام باید تا دویست درم را در بند کند و یکسال محبوس دارد آنگاہ پنج درم ازاں بدہد۔

خوش ہو کہ الحمد للہ اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا، وہ اٹھ گیا یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے، کیوں کر بخالت تعریف کے قابل نہیں اور اس کے لئے کہ سال میں دو سو درم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درم ان میں سے خدا کی راہ میں دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے:

یکے از فقہاء بر سبیلِ آزمائش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ در چند درم لازم آید گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی یا بر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو جواب فرما، شبلی گفت، بر مذہب فقیہاں از دویست درم بعد از حولانِ حول پنج درم باید داد و بر مذہب فقیران در حال ہر دویست درم باید داد و جان بہ شکرانہ بر سر باید نہاد، فقیہ گفت ما ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم شبلی گفت ما ایں مذہب از صادق رب العٰلمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ او ہر چہ داشت پیشِ سید عالم ﷺ نہاد و جگر گوشۂ خویشتن بشکرانہ داد (۱)

کسی نے حضرت شبلیؒ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہا کے مسلک پر، جواب چاہتے ہو، یا فقرا کے، کہا دونوں کے، فرمایا فقہا کے مذہب کے مطابق ایک سال گذرنے پر دو سو درم میں سے پانچ درم اور فقرا کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہئے، فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبرؓ سے حاصل کیا ہے، کہ جو کچھ تھا وہ سب سرورِ عالم ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہؓ) کو شکرانہ میں دیا۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ ﷺ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہلِ استحقاق میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر میں آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تا کہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ

(۱) مکتوب ۳۴ سہ صدی ص ۹۱-۹۲ مطبع اسلامی لاہور۔

کے لئے یکساں کھلا رہے اور اس لئے تا کہ بے قیدی و عدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو، مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تا کہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دست گیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج: دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے، بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی، اور دولت مند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی، عیاشی، اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا دینے کے روادار نہیں ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی وکوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں، قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس نے جواب میں یہی کہا:

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (قصص: ۲۸-۷۸) مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب کچھ ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانے کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی مشکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب و ہوا، اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں، لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت وطبیعت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے، سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بہ جائے

جماعت کی مِلک قرار دیں، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے جماعت کی حکومت قائم کی، زمین داری کا پرانا اصول جس میں کاشت کار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا، اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تا کہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تا کہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دست گیری کرے، یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاریؓ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے" یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے، (۱) اور شام کے دولت مند صحابہؓ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیوں کہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ (۲)

اقتصادی اور تجارتی فائدے: زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اوپر گزر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہی چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو، بقا سے مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں کیوں کہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، اور نمو سے یہ

(۱) مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۷۶۔ (۲) فتح الباری شرح بخاری ج ۶ ص ۴۵۱ وطبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز ص ۲۵۶ جزء خامس فی اهل المدینة من التابعین۔

مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزایش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بے کار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بہ سال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کرسکتا، اس طرح زکوٰۃ کا بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے، کیوں کہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنی پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اس بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو ان ہی چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے، صحابۂ کرامؓ اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے، ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بے کار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتا دیا تھا:

وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّھَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَھَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَبَشِّرۡھُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ۔ (توبہ:۹-۳۴)

اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔

یہ ''دردناک عذاب'' قیامت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں اور اس سے دولت کی افرایش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بے کار اور معدوم کرکے ملک کو فقر و محتاجی کے عذابِ الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں، اس لئے امرا کی اخلاقی اصلاح

اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔

فقرا کی اصلاح: اب دوسری طرف فقرا کا گروہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شارعینِ مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے اس کو تکلیف ہوگی، کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہیں رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سرتا پا مادۂ فاسدہ بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں، اس نے اس غمگین اور دردمند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں، جو اس کے دل کی ڈھارس، اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کی دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں، اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی، لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو، نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولت مندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں، اور اس سے دینے والوں کے جذبۂ ایثار اور ان

کی جود وسخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں، اس طرح ان کے لئے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی اور تمام رذیل وپست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہیں جہاں یہ تمام نجاستیں آ کر جمع ہوں گی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں، غریب وامیر اور مسکین ودولت مند دونوں آپ ﷺ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا، بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے، جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھ سکا، اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت وہمدردی کے تمام دروازے بند کر دئے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امرا کا طبقہ اپنے معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا، اور اگر غربا اور فقرا کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دے دی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ وبرباد ہو جائے گی، اسی لئے داعی اسلام علیہ السلام نے، انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امرا اور دولت مندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا:

اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحیٰ: ۹۳-۱۰) مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے۔

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقرا اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی:

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ:۲-۲۷۳)

ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولت مند سمجھتا ہے تو ان کو ان کی نشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

اور بھیک مانگنے کو خلاف تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے ان کو خطاب کر کے کہا:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ:۲-۱۹۷)

اور زادِراہ لے کر چلو کہ بہترین زادِراہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولت مندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسنِ اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ ولو بشق تمرۃ ''اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو''۔(۱) دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الید العلیا خیر من الید السفلیٰ (۲) ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے۔ یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ وخیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب ونفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک وصاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص وطمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

ان ھٰذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس (۳)

یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاقِ شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں ان میں سے کون سی چیز ہے جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقرا اور مہذب گداگروں کی امتیازی

(۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ ج ۱ص۱۹۰ (۲) ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلہ ج ۱ص۱۹۹ (۳) مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترکِ استعمال آل النبی علی الصدقۃ۔

شان نہیں بن گئی ہے، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھوٹ کر فقرا اور گداگروں کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے، تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرتاً ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ وخیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے، شریعتِ محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق وعادات پر جو برے اثرات پڑ سکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱- اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنونِ کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیوں کہ اس سے ایک طرف اگر دینے والی کی اخلاقی پستی اور دنائت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بہ بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے تو نفرت ہوگی پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (دہر: ۶-۷-۹)	ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھئے کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گذاری بھی نہیں چاہئے، پھر صدقہ دینے والوں کو یہ بھی بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل ورسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی، اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائے گا، فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ.

(بقرہ:۲-۲۶۲و۲۶۳)

جولوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں، ان کا اجران کے خدا کے پاس امانت ہے، اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشیں تشبیہ سے واضح کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ.

(بقرہ:۲-۲۶۴)

مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر برباد نہ کرو جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے، اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا، اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے، جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو، اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو، جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا، اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔

من جملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منّت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقرا اور معذوروں کو در بہ در کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲۔اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے، کیوں کہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے، تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی، اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اخفا اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمایش اور شہرت طلبی کی آلایشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو''۔(۱)

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے، یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا	اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر تم اس کو
وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ:۲-۲۷۱)	چھپا کر فقرا کو دو تو یہ تمہارے لئے بہت بہتر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفا کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے، اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک آیتِ کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبوی ﷺ میں تھا، یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اس لئے اخفا کا جو فائدہ فقرا کے حق میں ہے، وہ اس طرح خود بہ خود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہِ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے، اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے، اس میں فقرا کو براہِ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفا کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقرا کو دینے کی تصریح ہے، اس لئے اعلان اور اخفا کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے،

(۱) صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقۃ ج ۱ ص ۳۸۰۔

بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے، کہ اگر بیت المال اور نائبین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے لیکن اگر کسی سبب سے آپ کو براہِ راست مستحقین کو دینا پڑے، جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں، اور براہِ راست آپ ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے، اسی لئے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دیجئے، تاکہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت وخواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب، اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہؓ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیئے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳- تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دارومدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ وصدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو، کیوں کہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہوگا، کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی، اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت، حرص اور کمینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیوں کہ کوئی بری چیز کسی کو دے دینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ اس بے کار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحنِ خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بہ جائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے، روایتوں میں ہے کہ اصحابِ صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسبِ معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لا کر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا تو، مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا، چوں کہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ.

(بقرہ:۲-۲۶۷)

مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور اُن میں سے ردّی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالاں کہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لوگے، لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)۔

۴-فقرا و مساکین کی دنائت اور حرص وطمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن ہی لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے، جو باوجود تنگ دستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، کیوں کہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی، تو ہر شخص خود بہ خود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحابِ صُفّہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی، اس بناپر اسلام نے اُن کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا

(بقرہ:۲-۲۷۳)

صدقہ ان فقرا کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (بغرضِ معاش وتجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، خودداری اور عدمِ سوال کی وجہ سے اُن کو مال دار سمجھتے ہیں، تم صرف اُن کے بشرہ سے اُن کو پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵-لیکن بااین ہمہ حزم واحتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بناپر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی، اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے، انھوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں

سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو (۱) ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اُس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ (۲)

حکیم بن حزامؓ ایک صحابی تھے، انھوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا، آپ ﷺ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا ''اے حکیم! یہ مال بہ ظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے، جو اُس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی، اور جو لالچ کے ساتھ لے گا، اس کو برکت نہ ملے گی، اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' حکیمؓ نے کہا، ''یارسول اللہ ﷺ آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا، اس کے بعد اُن کا یہ حال ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں خلفا ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے اور وہ انکار کرتے رہے، اور آخر عمر تک اس انکار پر قائم رہے۔ (۳)

اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحبِ دست وبازو ہوں یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح وسالم ہوں، بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کردی گئی، فرمایا کہ:

لاتحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی (۴)	غیر محتاج اور صحیح وسالم آدمی کے لئے صدقہ حلال نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

والذی نفسی بیدہٖ لأن یاخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یاتی رجلا یسئلهٗ اعطاہ اومنعهٗ (۵)	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کا رسّی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھا اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اسے دے یا نہ دے۔

(۱) ابوداؤد کتاب الزکوۃ باب کراهیة المسئلة ج اص ۲۳۲ اصح المطابع کلکتہ۔ (۲) ایضاً ص ۲۷۸۔ (۳) صحیح بخاری کتاب الزکوۃ باب الاستعفاف عن المسئلة ج اص ۱۹۹۔ (۴) ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ماجاء من لاتحل له الصدقه ج اص ۱۴۱۔ (۵) کتاب الزکوۃ، باب الاستعفاف عن المسئلة ج اص ۱۹۹۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے، عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپ ﷺ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا، اور اُن کی قیمت سے ایک کلہاڑی خریدی، اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور بیچو، انھوں نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے اُن کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔(۱)

۶۔ لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسبِ معاش نہیں کر سکتے، ان کو بھی الحاح، کثرتِ سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

لیس المسکین الذی تردہ الاکلۃ والاکلتان	مسکین وہ نہیں، جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس
ولکن المسکین الذی لیس لہ غنی ویستحی	لوٹا دیتے ہیں، مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہیں ہے لیکن
ولا یسئل الناس الحافا(۲)	حیا کرتا ہے، اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔

پھر یہ بھی بتادیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو وہ ہر حال میں انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا:

مایزال الرجل یسئل الناس حتی یاتی یوم	آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے
القیامۃ لیس فی وجھہ مزعۃ لحم(۳)	روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا
	نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اُس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھو دی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو سکتی تھیں، اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک

(۱) ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب ماتجوز خیر المسئلۃ ج۱ص۲۳۲۔(۲) بخاری کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ عزوجل لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ج۱ص۱۹۹۔(۳) بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من سئل الناس تکثرا ج۱ص۱۹۹۔

کردیا، پست وبلند کے تفرقے ممکن حدتک کم کردیئے، اور اُس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتادیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہؓ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولت منداپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے سوادوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے، اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا (۱) اس طرح یہ ایک ایسا مالی واقتصادی نظام تھا کہ بلانفع قرض دینے میں افراد کو جوتامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر دادوستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

(۱) تفسیر کبیر سورہ توبہ جلد ۴ ص ۶۸۱۔

روزہ

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (بقرہ:۲-۱۸۳)

روزہ کا مفہوم: روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو "صوم" کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی "رکنے اور چپ رہنے" کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں "صبر" بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی "ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال" کے ہیں، ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا اور پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدتِ معینہ تک رُکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ: روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں، انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ سنسپر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصولِ معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرا کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ "روزہ کی ابتدا اصل میں اس طرح ہوئی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مُردوں کو پہنچ جاتا ہے" لیکن یہ قیاس اربابِ خرد کی نگاہ میں سندِ قبول حاصل نہ کر سکا۔(۱)

بہرحال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح میں اپنے پیرووں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے:

---

(۱) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ ص ۱۹۴ طبع ۱۱۔

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ.

(بقرہ:۲-۱۸۳)

مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تا کہ تم پرہیزگار بنو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَـٰتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ.

(بقرہ:۲-۱۸۵)

ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو انسانوں کے لئے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں اور حق وباطل میں فارق بن کر آیا، تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے، خدا آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں، تا کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو، اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تا کہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو اور تا کہ تم شکر بجالاؤ۔

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب، یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

روزہ کی مذہبی تاریخ: قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک جزر رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر امی جو بقول مخالفین، عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے:

> ”روزہ کے اصول اور طریقے گو آب وہوا، قومیت وتہذیب اور گرد وپیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو“۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے"

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل وشرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں سے جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں، ان کے یہاں چالیس چالیس دن تک کا ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات ودکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں، قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں، تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں، لیکن اُن کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم اُن کے ہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لئے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔(۱)

یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے(۲) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے تھے، لیکن چالیسویں دن کا روزہ اُن پر فرض ہے، جو اُن کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے، اور اسی لئے اس کو عاشورا (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا، جس میں حضرت موسیٰؑ کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے، اسی لئے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے، (۳) اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بہ تصریح مذکور ہیں۔ (۴)

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا، (۵) حضرت یحییٰؑ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیش رو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے، اور اُن کی اُمت بھی روزہ دار تھی (۶)، یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھا لئے تھے اور وہ زیادہ ترغم کے روزے تھے،

(۱) ان تمام حوالوں کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ ص ۱۹۳-۱۹۴ طبع یازدہم۔ (۲) (خروج ۳۴، ۲۸-۱۲۸ العہد القدیم ص ۱۴۵)۔ (۳) توراۃ سفر الاحبار ۱۶، ۲۹، ۳۴ و ۲۳، ۲۷ ص ۱۹۶ (لاویین) العہد القدیم ص ۱۷۵۔ (۴) سموائیل اول ۷-۶ العہد القدیم ص ۳۳۶ و یرمیا ۳۶-۶ ص ۱۱۳۴۔ (۵) متی ۴-۲ العہد الجدید ص ۶۔ (۶) مرقس ۲-۱۸ العہد الجدید ص ۵۹۔

اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس و غم گین بنا لیتے تھے، (۱) حضرت عیسیٰؑ نے اپنے زمانہ میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''کیا براتی جب تک دولہا اُن کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہیں، جب تک دولہا ان کے پاس ہے، روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا اُن سے جدا کیا جائے گا تب ان ہی دنوں میں روزہ رکھیں گے (۲)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مبارک اور براتی سے مقصود اُن کے پیرو اور حواری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں، ان ہی فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا، انھوں نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:

''پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔ (۳)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے اُن کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں، وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی۔'' (۴)

اہلِ عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا (یعنی دسویں محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانۂ کعبہ (۵) پر نیا

(۱) قضاۃ ۲۰-۲۶ ص ۲۱۶ العہد القدیم سموائیل اول ۷-۶ العہد القدیم ص ۴۳۶ و ۳۱-۱۳ ص ۴۸۱ و لوقا ۶-۱۶ وغیرہ۔
(۲) مرقس ۲-۱۸-۱۹ و ۲۰ العہد الجدید ص ۵۹۔ (۳) متی ۶-۱۶ و ۱۷ العہد الجدید ص ۱۱۔ (۴) متی ۱۷-۲۱ العہد الجدید ۳۲۔
(۵) مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۴۔

غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ میں یہود اپنا عاشورا الگ مناتے تھے، (۱) یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ:۲-۱۸۳)

مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت: انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل واسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں، اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرضِ نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض ومقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے لیکن کیا خوش نما کپڑوں، عالی شان عمارتوں، لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند وعیال، زر ومال اور خدم وحشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی ہے اور زندہ رہے ہیں، بروایت عام ابراہیم ادہمؒ بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پُرمسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو نقطے میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ مایہ قوت وغذا یعنی کھانا اور پینا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدرمق پر موقوف ہے، اور سدرمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم باب صیام یوم عاشورا جلد اول ص ۲۶۸۔

مولد ومنشاان ہی چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط، وسعت، تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے، اس بناپر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالمِ ناسوت اور عالمِ ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق وامتیاز کی دیوار قائم کی جائے، تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق وامتیازات کو محیط ہوگی، انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص وہوس اور قتل وخونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائیں تو ان ہی دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی۔

اس بناپر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل وشرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کردے، اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب وحرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی قوت کے نتائجِ مابعد ہیں، اگر یہ طلب وضرورت فنا ہوجائے تو ہم کو دفعتاً عالمِ ناسوت میں عالمِ ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے، اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کردی ہے، اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے، مجتنب ہوکر تھوڑی دیر کے لئے ملاءِ اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہوجانا چاہئے، اور چونکہ ان مخلوقات کا فرضِ زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت وعبادت ہے، اس لئے انسان بھی حتی الامکان اتنی دیر تک اپنی زندگی کا یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق ورموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کردیا ہے، اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی، اس بناپر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارتاً اس حقیقت میں شریک کرلیا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۳)	مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

روزہ کی غرض وغایت ”تقویٰ“ ہے یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچالینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا، لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے:

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۵)

تاکہ خدانے جوتم کوراہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو،اورشکرادا کرو۔

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کورمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت: یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے خدائے پاک نے عالمِ روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظامِ قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں، کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے، اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیوں کر مہاجرت الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیوں کر دعوت کے منکر ناکام وخاسر اور اہلِ ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منتظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے، قرآن مجید میں تیرہ مقام پر ''سنة اللہ'' کا لفظ آیا ہے، لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنالیتا ہے، بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائصِ نبوت کا اصولِ قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے ان ہی اصول وقوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحیِ الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے، کوہِ سینا کا پُر جلال پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) جب توراۃ لینے جاتا ہے، تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے(۱)، کوہِ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اُس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا(۲)، اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت ﷺ) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک

(۱) خروج ۳۴-۲۸ ص ۱۴۵۔ (۲) متی ۴-۲ العہد الجدید ص ۶۔

مہینہ حرا نام مکہ کے ایک غار میں، ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے، اور بالآخر اسی اثناء میں ناموسِ اکبر "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" (علق-۹۶:۱) کا مژدۂ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔(۱)

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ — رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اُترا۔

(بقرہ:۲-۱۸۵)

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ (دخان:۴۴-۳) ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اُتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ. (القدر:۹۷-۱) ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اُتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر امی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دست گیری کے لئے دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحیِ الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ وتنہا بھوکا اور پیاسا سربہ زانو تھا(۲)، اس بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ وتنہا رہنا (اعتکاف) نزولِ وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار اور سربہ سجود رہنا تمام پیروانِ محمدی ﷺ کے لئے ضروری تھا کہ:

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ — اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا۔

(آل عمران:۳-۳۱)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے، اور

(۱) صحیح بخاری حدیث بدء الوحی ج۱ص۲و۳ ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء الوحی ج۱ص۷۷ میں اور سیرت ابن ہشام بدء بعثت ج۱ص۱۵۰ میں ہے۔(۲) روایت سے اگرچہ بہ تصریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ ﷺ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن واشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا میں روزے بھی رکھتے تھے جیسا کہ بخاری (بدء الوحی ج۱ص۳) اور سیرت ابن ہشام (ج۱ص۱۵۰) سے واضح ہے کہ آپ ﷺ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے، جس کا ایک جز روزہ ہے، آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ﷺ ان دنوں روزہ سے رہتے تھے۔(دیکھو خضری مصری کی تاریخ التشریع الاسلامی ص۶و ص۴۳ دار احیاء الکتب العربیۃ مصر ۱۹۲۰ء۔

رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہِ اقدس میں بہ قدر امکان ان ہی حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہئے، جس میں وہ حاملِ قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات وحالات جن کو قرآن کے مبلّغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگذاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیتِ صیام کا مناسب موقع ۲ ہجری: اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرفِ عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے، اکثر یہ سعادت نصیب ہوجایا کرتی تھی، ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کردیا تھا، اس نے اُن کو عرب کے معمولی طریقۂ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کردیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے اُن سے تمدنی تعلقات منقطع کرلئے تھے، اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لئے موزوں ہوسکتا تھا، نماز وحج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقۂ عبادت تھا، جو بلاروک ٹوک جاری رہ سکتا تھا، لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جن کا استعمال صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب امراضِ روحانیہ پیدا ہوجاتے ہیں، یا اُن کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قوائے شہوانیہ اور زخارفِ دنیا کی شیفتگی اور لذاتِ حسیہ کے انہماک وتوغل سے جو روحانی مرض پیدا ہوسکتے تھے، مکہ میں یہ تمام سازوسامان مفقود تھے، بلکہ خود کفار کے جور وستم نے ان جذبات کا استیصال کردیا تھا، اس لئے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی، آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو وجہ کفاف سے بے نیاز کردیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا، اور اس میں روز بہ روز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا، یا عن قریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آکر اُن کو اپنا فریفتہ بنائے، اس لئے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا، جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیش تر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا (۱)، اس سے شبہہ یہ دور ہوجاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغازِ اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے اُن

(۱) تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ ہجری ج ۳ ص ۱۲۸۱ اور زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۷۰ ۴ مصر وزادالمعاد ابن قیم جلد اول ص ۱۵۸ مصر۔

کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالاں کہ اصولِ اسلام کے رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیروں کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لئے روزہ وسطِ اسلام میں فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکامِ قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانہ کے لئے موزوں تھا۔(۱)

ایامِ روزہ کی تحدید: روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا، تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اُس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افرادِ اُمت بہ یک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظامِ وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا، جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان، چنانچہ آنحضرت ﷺ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہؓ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گذارا اور آج تک کل امتِ محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسبِ توفیق روزہ رکھتی ہے، چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآنِ پاک میں ماہِ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفسِ انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اُٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ — اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا۔

(بقرہ:۲-۱۸۳)

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ:

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (بقرہ:۲-۱۸۳) — جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا:

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (بقرہ:۲-۱۸۴) — چند گنے ہوئے دن۔

مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا، جس

---

(۱) زاد المعاد ج ۱ ص ۱۵۸۔

سے سننے والے پر فوراً بوجھ پڑ جائے اور فرمایا ''چند گنے ہوئے دن'' اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا تاکہ طبیعت متوجہ رہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ:۲-۱۸۴) — تو جو تم میں بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے چند دنوں کی گنتی۔

مگر اسی طرزِ ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارتاً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے، وہ گنے ہوئے مقررہ ہوں گے، ورنہ مَعْدُوْدَاتٍ (گنے ہوئے) اور عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ۔۲:۱۸۴) (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (بقرہ۔۲:۱۸۴) (تاکہ تم شمار کو پورا کرلو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (بقرہ:۲-۱۸۴) — اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے:

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۴) — تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے، تو یہ بہتر ہے اس کے لئے، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی، اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ، اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ چند گنے ہوئے دن، ظاہر ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں انتیس اور تیس دنوں کے روزے، چند گنتی کے دن تو ہیں ہی (۱)،

(۱) عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے، جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہئے کہ ایام العرب کو جو تعداد میں سیکڑوں ہیں، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیوں میں محدود کر دے، اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے اور ہزار ہا انقلابات کو ایام اللہ کہا ہے (ابراہیم-۱۴:۵) ان کو نو تک کے انقلابات عالم میں محدود کر دے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا: سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ. (سبا-۳۴:۱۸) اور فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ۔ (الحاقہ-۶۹:۲۴) (گزرے ہوئے دن) جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران-۳:۱۴۰) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بہرحال رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ:۲-۱۸۵)

وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اُتارا گیا، اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلیں ہیں۔

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں جس کی یہ عظمت ہے، تم پر فرض کئے گئے، ارشاد ہوا:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ:۲-۱۸۵)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

اب پورے ماہِ رمضان کے روزوں کی تعیین و تحدید اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ کی تشریح ہوگئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرفِ زمان (۱) ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفہوم فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمان کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے صَامَ شَهْرًا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا، اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے، صام سنةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیتِ پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی مہینہ کہا گیا ہے، اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری سال جس کا عرب میں رواج (۲) تھا، اس کے مہینے حسبِ روایت کبھی تیس اور کبھی انتیس دن کے ہوتے ہیں، یہی اصول ماہِ صیام پر بھی صادق آئے گا، جیسا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ تمام

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکیں، جمع قلت و کثرت کا یہ قاعدہ بھی کلی نہیں، بلکہ عمومی ہے اور صرف ان الفاظ کے لئے ہے، جن کی جمع قلت و کثرت دونوں مستعمل ہیں، ایام کا لفظ ان میں نہیں، اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے اور وہ اَیْوَام ہے، جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سند کے لئے دیکھو رضی شرح کافیہ جلد دوم ص ۱۵۴-۱۵۵ بحث جمع مکسر اور لسان العرب لفظ یوم جلد سوم ص ۱۰۲۱ بیروت۔ (۱) تفصیل کے لئے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ ظرف زمان ص ۱۶۲ مطبع نول کشور ۱۸۶۸ء۔ (۲) جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (بقرہ:۲-۱۸۹)

لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں، کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لئے ہے۔

صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدینؓ اور جمیع فرقِ اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ: قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ:۲-۱۸۵) تو جو اس مہینہ کو پاوے وہ اس مہینہ روزہ رکھے۔

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہِ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہِ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہِ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہاں گذر نہ ہو، یہ صورت اُن قطعات ارضی میں پیش آئے گی، جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہیں جو باقی متمدن دنیا میں ہے، مثلاً جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں، کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں، ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کلینڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں۔ (جیسا کہ حدیثِ دجّال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے۔)(۱)

لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے، کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے، تا کہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت کے بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی، وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا، اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی (۲)

معذورین: جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، اُن کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لئے ارشاد ہے:

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ:۲-۱۸۵) اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الفتن و اشراط الساعة باب ذکر الدجال و صِفَتِہ ص ۵۱۵ وغیرہ۔ (۲) پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کے لئے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ ادا کرنے کی اجازت لکھی گئی تھی، وہ میری غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں۔

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کرے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو، یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزہ رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا، یا بار بار کے تجربوں کے بعد اس شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے، تو اُس کے لئے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے، اور اس کے بہ جائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے، فرمایا:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ:۲-۱۸۴)	تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے، جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ ہی کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ:۲-۱۸۴)	اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت ہو، وہ فدیہ ادا کریں، ایک مسکین کا کھانا۔

۱- بعض صحابہؓ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے، اُن روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں چاہے روزے کے بہ جائے ایک مسکین کا کھانا، ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

۲- دوسری روایت یہ ہے کہ یُطِيقُونَهُ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے، اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیتاً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعامِ مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے، جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے۔(۱)

۳- تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لئے ہے، جو روزوں سے معذور ہوں، جیسے بڈھے اور حاملہ۔

(۱) الفوز الکبیر، باب ناسخ منسوخ ص ۱۹ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۱ء۔

اصل یہ ہے کہ لفظ یُطِیقُونَ کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اِطَاقَۃ کو وُسْعٌ کے معنی میں سمجھا گیا ہے، اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دے دیں، تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ بھی روزہ کے بہ جائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالاں کہ یہ صریح غلط ہے، اس کے معنی تو ہوں گے کہ غربا روزے رکھیں، اور امرا فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے، اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے، اور آیت مابعد کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ۔۲: ۱۸۵) (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں، اس لئے یُطِیقُونَ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ کے بہ جائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔(۱)

---

(۱) اطاقة طاقة کا باب افعال سے مصدر ہے، اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا فعل بنانے کے لئے باب افعال مستعمل ہے اور طاقة کے معنی لسان العرب (ج ۲ ص ۶۲۸) اور تاج العروس (ج ۶ ص ۴۲۷) وغیرہ میں یہ لکھے ہیں:

والطوق الطاقة ای اقصیٰ غایته وھو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعله بمشقة منه.

طوق کے معنی طاقت کے ہیں، یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے۔

طاقت کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (بقرہ: ۲-۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں۔

’’جس کی ہم کو طاقت نہیں‘‘ کے یہ معنی نہیں ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے، کیوں کہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی ایسا حکم نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ: ۲-۲۸۶)

اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اسی کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس لئے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالئے جس کو ہم اٹھا ہی نہ سکتے ہوں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اب روزہ کے سلسلے میں معذورین کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو، جیسے مرض یا خوف مرض یا سفر تو اُن کے لئے یہ آیت ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ:۲-۱۸۴)	تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) صحیح نہ ہوگا، بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بہ مشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ:

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (بقرہ-۲:۲۴۹)	آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ ہی نہیں کر سکتے بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بہ مشکل مقابلہ کر سکتے ہیں، حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، ابوداؤد (کتاب الصیام باب من قال ھی مثبتۃ للشیخ و الحبلی ج ۱ ص ۳۱۷) میں ہے:

عن ابن جبیر عن ابن عباس وعلی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین قال کانت رخصة للشیخ الکبیر والمرأة الکبیرة وھما یطیقان الصیام ان یفطرا ویطعما مکان کل یوم مسکینًا	ابن جبیر ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ **یطیقان الصیام** کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا اڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی تھی، اب بحمد اللہ کہ یہ تائید بھی ہاتھ آ گئی ہے سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود شرح ابی داؤد (ج ۲ ص ۲۶۶) میں اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: **لکن مع شدة وتعب ومشقة عظیمة** اسی طرح محدثین حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، والحمد للہ۔

ان وجوہ سے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں بلکہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے، اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کر لے، اسی میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگئی، اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے، اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابلِ ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المرض ہو، بہت ہی کمزور ہو، یا بہت بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتا ہو تو وہ روزہ قضا کرے، اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے، اس کے لئے یہ آیت ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ — اور ان پر جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔ (بقرہ:۲-۱۸۴)

اور ظاہر ہے کہ جب بہ مشکل روزہ پر قادر ہو، اس کو فدیہ کی اجازت ہے، تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاولیٰ فدیہ کی اجازت ہوگی، کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (بقرہ۲:۲۸۶)

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب: علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گو لغزش گاہیں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لئے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے(۱) سفر الاحبار میں ہے:

"اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی، جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے"۔

توراۃ کے سفر العدد(۲) میں ہے:

"اور اس ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو"۔

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو

---

(۱) سفر الاحبار۱۶-۲۹ العہد القدیم ص ۱۸۵۔ (۲) توراۃ سفر العدد ۲۹-۷ العہد القدیم ص ۲۶۳۔

لفظ استعمال کیا ہے، وہ "صوم" ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز واجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزے کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہیں:

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ — خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا۔

(بقرہ:۲-۱۸۵)

اسلام کا قانون ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ:۲-۴۰) — خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مُبلّغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے۔

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف:۷-۱۵۷)

وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے، اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں، اُن سے اُتارتا ہے۔

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات واحکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اس سلسلہ میں داخل ہے، اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی اُن سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں، بہ تدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات: اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان میں اکثر روزہ صرف پیروؤں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروان مذہب کے لئے برابر طور سے ضروری ہے۔

اسلام میں پیشوا غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اُس نے تمام پیروؤں کو عام حکم

دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی:

فَمَنْ شَہِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ:۲-۱۸۵) اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔

۲-اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر وتبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں، تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہیں، اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے۔

۳-جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص واستثناء نظر سے نہیں گذری، توراۃ میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا، یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں، مگر یہودیوں کے پاس آکر رہا ہو۔(۱) لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرتاً قادر نہیں، مستثنیٰ ہیں، ان میں سے بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالتِ سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں، اور جو دائمی طور سے معذور ہیں وہ روزہ کے بہ جائے ایک مسکین کو کھانا کھلاویں:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ:۲-۱۸۴)

اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں روزہ رکھ لے، اور وہ لوگ جو بہ مشکل روزے رکھ سکتے ہوں، ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

ترمذی میں ہے (۲):

عن انس قال النبی ﷺ ان اللہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ، اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا۔

(۱) احبار ص ۱۶-۲۹ العہد القدیم ص ۱۸۵۔ (۲) ترمذی ج ۱ ص ۱۵۲ مطبوعہ دیو بند۔

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے اگر اُن کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہوتو روزہ قضا کر کے دفعِ عذر کے بعد قضا رکھیں۔

۴-اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب (۱) کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵- جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک ایک روزہ قرار دیا:

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (بقرہ:۲-۱۸۷) پھر روزہ کو رات تک ختم کرو۔

۶-یہودیوں کے ہاں یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھالیتے، کھالیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھالیتے کھالیتے، سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتداءً اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، اُن کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو اُن کی بیوی کھانا لے کر آئیں، وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، اُن کو غش آگیا، اُس پر یہ آیت اُتری:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ
(بقرہ:۲-۱۸۷)

اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔

۷-شروع اسلام میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علاحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لئے یہ ممانعت محدود کر دی، اور رات کو اجازت دے دی:

(۱) مصنف کی مراد طلوعِ فجر سے ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ، فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (بقرہ:۲-۱۸۷)

روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لئے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم اُن کی، خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے، تو اُس نے معاف کیا، اب بیویوں سے ملو جلو، اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔

۸- بھول چوک اور خطا ونسیان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھاپی لے، یا کوئی اور کام بھول کر ایسا ہی کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی هريرة من اكل او شرب ناسياً فلا يُفطِر فانما هو رزق رزقه الله (۱)

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، جو بھول کر کھائے یا پئے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔

۹- اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے، بلکہ بے ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا:

قال النبی ﷺ لا يفطر من قاء ولا من احتلم (۲)

پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا جس کو قے (۳) ہوگئی یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی، اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۱۰- یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لئے روزہ کی حالت میں وہ زیب وزینت نہیں کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

''پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے، اپنے سر پر چکنا لگا، اور منھ دھوتا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارا تجھے بدلہ دے''۔ (۴)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لئے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ

---

(۱) ترمذی ابواب الصوم باب ماجاء فی الصائم یاکل ویشرب ناسیا ج ا ص ۱۵۳۔ (۲) ابوداؤد کتاب الصیام باب فی الصائم یحتلم نهارا فی رمضان ص ۳۲۳۔ (۳) قے ہونے کی فقہ حنفی میں کئی صورتیں ہیں، ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔ (۴) (متی ۶-۱۶ تا ۱۸ العہد الجدید ص ۱۱)۔

لگانا، خوشبو ملنا، اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی خوشی، رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

۱۱- روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے، کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افرادِ ملت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے، ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہؓ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی — تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے، جب مہینہ گذر گیا، تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔ (۱)

روزہ کے مقاصد: اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں گو سطورِ بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہیں ہے، بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے، اور ان مصلحتوں اور منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفۂ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتادیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اُس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا، تین مختصر فقروں میں بیان کر دیے ہیں:

۱- لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ-۲:۱۸۵) — تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اُس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔

۲- وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ-۲:۱۸۵) — اور تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

(۱) بخاری ج ا ص ۲۶۳ کتاب الصوم باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

۳-لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. (بقرہ-۲:۱۸۳) تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت معینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی، اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے، اور انھوں نے اس طرح اپنی روح کو عالمِ بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہاں تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغامِ ربانی نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے، تب توراۃ کی لوحیں اُن کو سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گذارے تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا، محمد رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروفِ عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حاملِ قرآن کی پیروی: اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک ومقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں، عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہئے تھا، مگر انھوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام وسنن کی اتباع نہیں کی، اس کی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گذاریں، چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ:۲-۱۸۳)

اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (اُن کے رسولوں کی پیروی، اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا۔

دینِ الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیمِ محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا، محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروروں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی، اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ: یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس

عظیم الشان احسان کا جو اس نے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکریہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتابِ الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایتِ روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی وذلت کے عمیق غار سے نکال کر اُن کو اوجِ کمال تک پہنچایا، اُن کی وحشت کو تہذیب واخلاق سے، اُن کی جہالت کو علم ومعرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت ودانائی سے، اور اُن کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے اُن کی قسمتوں کے پانسے الٹ دئے، اور فضل ودولت اور خیر وبرکت کے خزانوں سے اُن کے کاشانوں کو معمور کردیا، جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشتِ خاک کو ہم دوشِ ثریا بنادیا، قرآنِ پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۵)	اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تا کہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی، اور تا کہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

اس ہدایتِ ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گذاری کا یہ رمز واشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عید گاہوں میں جاتے، اور خوشی ومسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانۂ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ: روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیز گاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (بقرہ۔۲:۱۸۳)	اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

۱۔ ''تقویٰ'' دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجھک معلوم ہونے لگتی، اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے، اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور

کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اُن نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا کہ ''روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے''۔(۱)

۲- اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہئے، کہ دن رات میں ایک وقت کا کھانا کھائے، اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے، ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا، یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرتاً کمزور اور دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، اُن کو روزہ کے بہ جائے حکم ہوتا ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (بقرہ:۲-۱۸۴)

اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے:

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (بقرہ:۲-۱۹۶)

تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ ہے۔

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں، جس کو تمتع کہتے ہیں، اُن پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ:۲-۱۹۶)

تو دس روزے رکھیں تین حج میں اور سات گھر آ کر۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لے جا کر ذبح کیا جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (مائدہ:۵-۸۹)

یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم باب الصوم لمن خاف علی نفسه العزوبة ج۱ ص۲۵۵۔

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے، تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے:

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (مائدہ:۵-۸۹) تو تین دن کے روزے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے، تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو:

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (مجادلہ:۵۸-۴) تو دو مہینے متواتر روزہ۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو:

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (مجادلہ:۵۸-۴) تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے بہ خوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات، غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

۳- روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے اُن کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو، اس کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیوں کر ہوگا، بقول حافظ ابنِ قیم سوزِ جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار و رحم اور ہم دردی کے جذبہ کو پیدا کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہؓ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت ''بادِ رواں'' کی طرح ہوتی تھی (۱) اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے یہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت کی جاتی ہے، اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴- انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے، کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدانِ جنگ میں بھوک اور

(۱) صحیح بخاری ج ۱ باب بدء الوحی ص ۳ و کتاب الصوم جلد ۱ باب اجود ما کان النبی ﷺ فی رمضان ج ۱ ص ۲۵۵۔

پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مرتبہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش، جد وجہد، سختی ومحنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی ''صبر'' کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵- جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے، طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون ومستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، اُن کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے، بشرطے کہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار وسحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶- انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

۷- انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل ودماغ تبخیرِ معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس پر گواہِ صادق ہے۔

۸- روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسانی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے، بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص

کفارہ ہی کہا گیا ہے،(۱) اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، اگر اس کی سکت نہ ہو:

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (مائدہ:۵-۸۹)	تو تین دنوں کے روزے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو، اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو:

اَوْعَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ (مائدہ:۵-۹۵)	یا اس کے برابر روزہ تا کہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے، اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔

علی ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خوں بہا یعنی ایک مسلمان غلام آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو:

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (نساء:۴-۹۲)	تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لئے دو مہینے کے لگاتار روزے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹- اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ، شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیتِ خاطر، یہ جذبات کا سکون، ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لئے بالکل موزوں ہے، اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں

(۱) احبار ۱۶-۳۰ سے ۳۴ تک العہد القدیم ص ۸۵ و ۲۳-۲۷ ص ۱۹۶۔

کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔(۱)

۱۰۔ان ہی باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا، یا یوں کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ ''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے، تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے''۔(۲) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اس کو چاہئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ بکے، اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں(۳)، بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کرو''(۴) صحابہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا جھوٹ اور غیبت سے(۵)، چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔(۶)

---

(۱) صحیح بخاری باب بدء الوحی جلد اول ص ۴۔(۲) صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵ و ترمذی ابواب الصوم باب ماجاء فی التشدید فی الغیبة ج ۱ ص ۱۵۰ دیوبند و ابوداؤد کتاب الصیام باب الغیبة للصائم ص ۳۲۲ اصح المطابع کلکتہ و ابن ماجہ ابواب ما جاء فی الصیام باب ما جاء فی الغیبة والرفث للصائم ص ۱۲۲۔(۳) صحیح بخاری کتاب الصوم باب هل یقول انی صائم اذا شُتِمَ ج ۱ ص ۲۵۵ و صحیح مسلم کتاب الصیام باب حفظ اللسان للصائم جلد ۱ ص ۳۲۷ مصر و مؤطا امام مالک کتاب الصیام جامع الصیام ص ۹۷ و نسائی کتاب الصیام فضل الصیام ج ۱ ص ۲۴۰ دیوبند۔(۴) سنن دارمی کتاب الصوم باب الصائم یغتاب فیخرق صومه ص ۲۱۸، جمع الفوائد کتاب الصوم فضل الصوم وفضل رمضان ص ۱۵۲ مطبع خیریہ میرٹھ بحوالہ نسائی ص ۲۴۱ مطبوعہ دیوبند۔(۵) جمع الفوائد بحوالہ طبرانی الاوسط ج ۱ ص ۱۵۲ میرٹھ۔(۶) فتح الباری جلد ۴ ص ۸۸۔

۱۱-تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمایش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشانہیں ہوسکتا، اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲-اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لئے:

الصّوم لی و انا اجزی بہ(۱) روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ. (زمر:۳۹-۱۰) صبر کرنے والوں کو اُن کی مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی ''صابرین'' کی جماعت میں داخل ہو کر اجرِ بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳-روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے:

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ:۲-۱۵۳) اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیوں کہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے اس کی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ مقرر کیا ہے، اسی لئے اس آیتِ بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہیں۔(۲)

۱۴-یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمالِ حسنہ میں ہے، جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاپوشی، گناہوں کی معافی اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الصوم باب ھل یقول انی صائم ج۱ص۲۵۵ وموطا کتاب الصیام جامع الصیام ص۹۷۔ (۲) تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ جلد۱ص۱۹۹، مطبع میمنیہ مصر۔

وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصَّآئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّ الذّٰکِرٰتِ اَعَدَّاللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا.

(احزاب:۳۳-۳۵)

......اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے اور یاد کرنے والی عورتیں اُن کے لئے اللہ نے تیار رکھی ہے، معافی اور بڑی مزدوری۔

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

حج

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ (آل عمران:۳-۹۷)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے، اس کے لفظی معنی ''قصد اور ارادہ'' کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیمؑ کی بنائی مسجد خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے، کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل، خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس کے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اُس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا، اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر رفتہ رفتہ اُس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کی، اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصور احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے، ایک اُس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی، اور اسی محافظ یا دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی، اس کے معبد کا صحن دار الامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور

حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔(۱)

حضرت ابراہیمؑ کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی، یہاں بھی بہ دستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے اُن کو اس کے لئے تکلیفیں دیں، اور بالآخر اُن کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے، جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے اُن کی حکومتیں قائم تھیں، آثار قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی، اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیجِ فارس کے سواحل سے عراق کو پہنچی تھیں، اور شام و فلسطین گئی تھیں، اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمراں تھیں۔(۲)

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا اور بحرمیت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی، جس کو اُن کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت مقرر کی، یہ تمام مقامات وہ شاہِ راہ تھی جس پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن، اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں، سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے، اور دوسرا یہ کہ خدا کی توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے یہ گذرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبّار و قہّار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں، علاحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

(۱) توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے، اور میری تصنیف ''ارض القرآن'' میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔ (۲) میری تصنیف ''ارض القرآن'' جلد اول ص ۷۰ و مابعد میں اس پر مفصل بحث ہے۔

بیت اللہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں اُن کی تین قربان گاہوں یا ''خدا کا گھر'' بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

''تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا، اور اُس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا، ایک قربان گاہ بنائی، اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے ''بیت ایل'' (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عای اس کے پورب تھا، اور وہاں سے اُس نے خدا کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا''۔(۱)

اس کے بعد ہے:

''اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل میں اس مقام تک پہنچا.......... جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے ابراہیم نے خدا کا نام لیا۔(۲)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں اُن کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا اور حکم ہوا۔

''اٹھ اور اس کے طول و عرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا، اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں، جا رہا، اور ایک قربان گاہ بنائی۔(۳)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی، جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحٰقؑ کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی۔

''اور اس نے وہاں مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا، اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہاں اضحٰق کے نوکروں نے کنواں کھودا''۔(۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں،

''اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اُس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا، دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا''۔(۵)

---

(۱) ۱۲-۷و۸ العہد القدیم ص ۱۹ (۲) ۱۳-۳و۴ ص ۲۰ (۳) ۱۳-۱۷-۱۸ ص ۲۰ (۴) پیدائش ۲۶-۲۵ ص ۳۱ (۵) ۲۸-۱۸-۲۲ ص ۳۵۔

حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے:

''اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو کیوں کہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اُسے ناپاک کرے گا اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تا کہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو''۔(۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے بموجب،

''اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے ۱۲ فرقوں کے لئے بارہ ستون بنائے......

......اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے باسنوں میں رکھا، اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا''۔(۲)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں، کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اُس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کے شرائط: اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بہ موجب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا، اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، اور یہ بحث بھی وہیں گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے، کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کردیا جائے، وہ نذر کردہ جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا، اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کئے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہوجاتے تھے، تب اُن کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی، وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

---

(۱) خروج ۲۰، ۲۵، ۲۶ ص ۱۲۰۔ (۲) خروج ۲۴، ۴، ۶ و ۷ ص ۱۲۵۔

ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے: توراۃ اور قرآنِ پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور اُن کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے۔(۱)

''خداوند فرماتا ہے، اس لئے کہ تو نے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہاں اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت، دوں گا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوجائے گی، اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیوں کہ تو نے میری بات مانی''۔

قرآن پاک میں ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

(بقرہ:۲-۱۲۴)

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کے لئے پیشوا بنانے والا ہوں۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ . اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ .

(بقرہ:۲-۱۳۰و۱۳۱)

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے، جب اُس کے خدا نے اُس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کردے، اُس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کردیا۔

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ . قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ. (صٰفٰت:۳۷-۱۰۴،۱۰۵)

اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یوں ہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم

خدایا تو محمد اور محمد ﷺ کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی۔

---

(۱)۲۲: ۱۶، ۱۷، ۱۸ص ۲۳۔

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسویٰ اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا، جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی ''پیشوائی'' اور آخرت کی نیکی نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی، اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشیدِ حقیقت کا ظلِ مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے: اسلام کے لفظی معنی ''اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا، اور اطاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا'' ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرماں برداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ۔ (صافات: ۳۷-۱۰۳)	جب ابراہیم اور اسمٰعیل اسلام لائے (یا فرماں برداری کی، یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔
وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ . اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (بقرہ: ۲-۱۳۰ و ۱۳۱)	اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا لیکن جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا، اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اُس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا (یا فرماں برداری کر، یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا میں نے پروردگارِ عالم کی فرماں برداری کی (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا۔)

الغرض ملتِ ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انھوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا، اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے، اور یہی ابراہیمی ملت ہے، اور اسی بارِ امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے کہ اُن کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں، اور بالآخر اُن کی نسل میں وہ امین پیدا

ہو جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا پر وقفِ عام کر دے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَا سِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ.

(بقرہ:۲-۱۲۸و۱۲۹)

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرماں بردار) بنا، اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرماں بردار) جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بتا اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا، اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار، اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائے، اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور اُن کو پاک وصاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ محمد رسول اللہ ﷺ تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینۂ محمدی کا خزانۂ علمی و عملی تھا، اور یہ مناسکِ اسلام کے ارکانِ حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی؟: حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی تورات میں اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے، اور بلوطوں کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر تورات کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ سے ۱۸۹۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے، اس میں اس مقام کا نام "مُریّا" لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو ان ہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا ہے، اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے، جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے۔

"خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت اکنوں پسر خود را کہ یگانۂ تست و اورا دوست می داری، یعنی اسحاق را بردار و بہ زمین موریا، برد، و اورا در آں جا بر یکے از کوہ ہائے کہ بتو نشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذراں، بامداداں (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدھا) خود را بیار است و دو نفر از نوکرانِ خود را با پسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوے آں مکانے کہ خدا اورا فرمودہ بود، رفت و در روز سوم ابراہیم چشمان خود را بلند کردہ آں مکان را از دور دید، آں نگاہ ابراہیم بہ خادماں گفت شما دریں جا نزد الاغ بمانید، تا من با پسر بدآنجا رویم، و عبادت (دوسرے

ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد شما باز آئیم۔(۱)

اس عبارت میں اسحٰق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے، اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف واضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گذر چکی ہے، اور ہماری جماعت میں سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے ''(الرائی الصحیح فی من ھو الذبیح) نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے۔ اس لئے یہاں یہ بحث بے محل ہے، بہر حال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا، وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا، کہ جس مقام پر قربانی گذرانی جائے وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لئے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا، اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف ومشہور ہوا کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جاسکے کہ ''میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں'' یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں، اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کرسکے، اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی، اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس یا مسیح کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا، نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی، اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی تھی، تاہم اصل شے باقی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے کہ ان سب کو خانۂ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اسی کی قسمیں کھاتے تھے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانۂ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصویریں بھی تھیں۔(۲)

---

(۱) پیدائش ۲۲: ۱ تا ۶۔ (۲) اخبار مکہ للازرقی ج ۱ ص ۱۰۴ مطبع ماجدیہ مکہ ۱۳۵۲ھ و فتح الباری ابن حجر کتاب المغازی باب این رکز النبی ﷺ ج ۸ ص ۱۴ و سیرت ابن ہشام ذکر الاسباب الموجبۃ اللمسیر الی مکہ و فتح مکہ ج ۲ ص ۲۷۳-۲۷۴۔

مکہ اور کعبہ: کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا "سمت القدم" ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سبھی بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ:

اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (آل عمران:۳-۹۶) سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج:۲۲-۲۹و۳۳) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی البیت العتیق (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی، فرمایا:

اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (بقرہ:۲-۱۲۷) ابراہیمؑ جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر آخر اسی گم نام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام ونشان صحرا میں ہر چہار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لئے قرآن پاک نے کہا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا (حج:۲۲-۲۶) اور ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ کو "ٹھکانہ" بنایا، کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتا دی، اور اس کو ان کی جاں پناہ اور ٹھکانہ بنا دیا، کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں، توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیوں کہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ کو قربانی کرنے کے لئے لائے تھے، اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی

اس گھر کی ایجاد نہیں بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو عبادت گزاروں کے لئے پاک وصاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعۂ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا، کہ یہ شام کی جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا، اور کبھی اس کا نام ''بیابان'' تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان وصحرا ہی کے ہیں (۱) اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ (ابراہیم:۱۴-۳۷) خداوندا میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لاکر بسایا ہے۔

تو حقیقت میں یہ ''بن کھیتی کی ترائی'' اور ''بے آب و گیاہ میدان'' اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی، اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی، اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی:

وَارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (بقرہ:۲-۱۲۶) اور خداوندا! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔

''مکہ'' قدیم زمانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی ''گھر'' کے ہیں، (۲) اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی، جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے، اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی، اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے، مکہ کا بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گذر چکا ہے، یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں ''بکّ'' کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے:

---

(۱) اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ''ارض القرآن'' کی پہلی جلد میں ہے، از ص ۵۷ تا ۶۰ طبع اول۔ (۲) تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان ص ۲۴۴ مصر۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ — پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ (آل عمران:۳-۹۶)

کعبہ کے لغوی معنی ''چوکھونٹے'' کے ہیں، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے، اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

''ثمودیوں اور سباوالوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔''(۱)

اور ثمود کا مقام شام وحجاز کے حدود میں تھا، اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے، اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں، خانۂ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسۂ مشاورت کیا، اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آیندہ لڑائی میں شریک نہیں ہوسکتے، کیوں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کردے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا:

''تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے، کہ عن قریب وہ موسم آنے والا ہے، جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہیں، اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔''(۲)

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے، اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بہ کثرت ملتا ہے(۳)، یہاں تک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں

---

(۱) گبن کی تاریخ عروج وزوال روم باب ۵۰۔ (۲) نتائج الافهام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر ص ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء۔ (۳) مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن مطبوعہ کویت ۱۴۰۰ھ/ہجری۔ ۱۹۸۰ء ص ۳۶ تا ۳۸ میں اس قسم کے اشعار جمع کردئے ہیں۔

بھی اس موسم حج کا اچھا خاصا حصہ تھا(۱)، اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک میں پہنچنے میں کامیابی ہوئی، کیوں کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے: حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اس پر لبیک کہا تھا، اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے، اور عین اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا، اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی:

اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ . قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ......وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ. (صٰفّٰت: ۳۷-۱۰۴، ۱۰۵ و ۱۰۷)	یہ کہ اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں،......اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا۔

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا، اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرۂ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَّاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی وَّعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ . وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ	اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا، اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کرو، اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے، جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا، اور جس نے انکار کیا، اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا، پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کروں گا، اور وہ کتنی بری بازگشت ہے،

(۱) کتاب الامکنہ والازمنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد ۱۳۳۲ھ جلد ۲ صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰۔

اَلْعَلِيْمُ. رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ. اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

(بقرۃ:۲-۱۲۵تا۱۳۱)

اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب! (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما، بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے، اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابع دار (مسلم) فرقہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے ارکان دکھا، اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر، (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے، اے ہمارے رب! ان میں ان ہی میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کو پاک وصاف بنائے، بے شک تو غالب اور دانا ہے، اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے گا، بہ جز اس کے جو اپنے آپ کو نادان بنائے، حالاں کہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا، اور آخرت میں وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا، یاد کرو جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابع دار (مسلم) بن جا، اس نے کہا عالم کے پروردگار کا میں تابع دار (مسلم) بن گیا۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا، کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف، قیام، اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر، ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں، اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیے ہیں (ان کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں، تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ، اس

نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ. ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ

(حج:۲۲-۲۶ تا ۳۰)

کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں، اور اپنی منتیں پوری کریں، اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ. رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ. رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ.

(ابراہیم:۱۴-۳۵ تا ۳۸)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا شہر بنا، اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری پیروی کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا، اور جو میری نافرمانی کرے گا تو تو بخشنے والا مہربان ہے، اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے پروردگار یہ اس لئے تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کریں، تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں، اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ یہ تیرے شکر گذار ہیں، اے ہمارے پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں، اور جو ظاہر کریں، اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ. فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ.

(آل عمران:۳-۹۵ تا ۹۷)

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی کرو شرک سے منہ موڑ کر، اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا، بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور دنیا کے لئے راہ نما، اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہو، وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے، جس کو اس

کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو، اور جو (اس قدرت کے باوجود) اس سے باز رہے، تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے، ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے، اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے، تا کہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائیں، یہ ٹھکانہ عنایت کیا، جو ازل سے اس کام کے لئے منتخب تھا، تا کہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں، اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گذاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران تھا، اور پیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا، اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں، اور ان کو اس لئے بساتا ہوں تا کہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے رہیں، اور تیری خالص عبادت بجالائیں، ان میں جو نیکوکار ہوں وہ میرے ہیں، اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا، جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں، اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے، اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں، اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کریں، اور یہاں اسماعیلؑ کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں، اپنی نذر پوری کریں، اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہوں، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں، اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبایش و آرایش اور عیش و آرام اور پرتکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں، اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراۃ کے حوالوں سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کا دستور تھا

کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے، تمدن کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بہ جائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے، وہاں قربانی گذرانتے، اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالوں سے گذر چکا ہے کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لئے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا، نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرا لگاتا تھا، پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ ''اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو'' (۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے، اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے، توراۃ کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے، مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں ''لبیک'' کہا اور اردو میں ہے کہ ''میں حاضر ہوں'' کہا، یہی صدا لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گذر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے، یا نثار کرتے تھے، حج میں یہ طواف کہلاتا ہے، غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں ''حج'' ہے۔

حج کی حقیقت: ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا، اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم ورضا اور فرماں برداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے، اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں، اس لئے اتنے دنوں تک (یعنی احرام کے زمانہ میں) سر کے بال نہ منڈاتے ہیں نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش ونشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، یعنی نہ خوشبو لگاتے ہیں

(۱) خروج-۲۶:۲۰۔

نہ سلے کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں، نہ شکار کرتے ہیں نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں، نہ بیوی سے ہم بستر ہو سکتے ہیں، اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد وغبار میں اٹے ہوئے، دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں، اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

لَبَّيْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْکَ لَبَّيْکَ لَا شَرِيْکَ لَکَ	میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں،
لَبَّيْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا	تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی
شَرِيْکَ لَکَ (۱)	ہیں، اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے، اور چوں کہ وہ اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں، اس لئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ گئے تھے، کہ وہ مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے، وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشایش چاہتے ہیں، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں، اور آیندہ زندگی کے لئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں، اور یہی در حقیقت حج کا اصلی رکن ہے (۲)۔

یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگوں کے نقش قدم، اور ان کی دعا کے مقامات، اور تجلیات ربانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل وصورت، ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب وگیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا ومغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار اور

(۱) صحیح مسلم: کتاب الحج باب التلبیة وصفتها ووقتها ج اول ص ۳۴۵ وایضاً باب حجة النبی ﷺ ص ۳۶۸۔

(۲) ترمذی کتاب الحج باب ماجاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج ج ۱ ص ۱۷۸۔

پھراس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کرمحمد رسول اللہ ﷺ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اوراسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے، جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھراپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں، اوراس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی، اوراسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جوکبھی اسی میدان میں اسی موقع پراوراسی حالت اوراسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعیِ توحید نے اپنے عمل اوراپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موج زن ہوتے ہیں، اوران کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں (۱):

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ. (انعام:۶-۸۰)	میں نے ہرطرف سے منہ موڑ کراس کی طرف منہ کیا، جس نے آسمانوں کواورزمین کو پیدا کیا، موحد بن کراور میں ان میں نہیں جوخدا کا شریک بناتے ہیں۔
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. (انعام:۶-۱۶۳و۱۶۴)	میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے، اور میں سب سے پہلے فرماں برداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہوں۔

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اورارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات: حج کی فرضیت دوسرے عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان، اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کی تعلیم دی، اور بہ تدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی، اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزہ نے بھی یوم عاشورہ سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا، جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقۂ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ

(۱) صحیح مسلم جلد اول کتاب الحج مختلف ابواب۔

رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱- ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت، اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنالیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آ کر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا، اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آبا و اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ:۲-۲۰۰)

جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔

۲- قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے، اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹادی گئیں، اور یہ آیت اتری:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج:۲۲-۳۷)

خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے، اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۳- اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے، تو زاد راہ لے کر نہیں چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (۱):

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ:۲-۱۹۷)

زاد راہ ساتھ لے کر چلو، کیوں کہ بہترین زاد راہ پرہیز گاری ہے۔

۴- قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لئے تھے، ان

(۱) بخاری جلد ا ص ۲۰۶ کتاب الحج باب قول اللہ وَتَزَوَّدُوْا الخ۔

کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانۂ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے، (۱) ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للّٰہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا، اور مرد، مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لئے کپڑا مستعار دیتی تھیں، اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا، (۲)، اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا، اور یہ آیت اتری:

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۷-۳۱) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آیندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا، اور اس وقت سے یہ رسم (۳) اٹھ گئی۔

۵- قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے، لیکن وہ خود حدودِ حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت (۴) اتری:

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔

(بقرہ: ۲-۱۹۹)

۶- صفا اور مروہ کے درمیان جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گذرتے تھے، اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا (۵) یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

۷- جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے، شوروغل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی

---

(۱) طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہؓ سید الشہداء القسم الاول الجزء الثالث ص ۶ لیڈن ۱۳۲۱ھ۔ (۲) بخاری جلد ۱ ص ۲۲۶ کتاب الحج باب الوقوف بعرفۃ۔ (۳) صحیح بخاری کتاب الحج لایطوف عریان جلد ۱ ص ۲۲۰۔ (۴) بخاری کتاب الحج باب الوقوف بعرفۃ جلد اول ص ۲۲۶۔ (۵) ایضاً ص ۲۲۳ باب السعی بین الصفا والمروۃ و باب بنیان الکعبۃ باب القسامۃ فی الجاہلیۃ ج ۱ ص ۵۴۳۔

ہوتی تھی، غرض فسق وفجور کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا، اور حج کو تقدس، تورع، نیکی، اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا، حکم آیا:

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللهُ (بقرہ:۲-۱۹۷)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں نہ شہوت رانی کی باتیں کرنا، اور نہ گناہ کرنا، اور نہ لڑائی دنگا ہے، اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہوگی۔

۸- مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہ گار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہ گار نہ تھا اس لئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى (بقرۃ:۲-۲۰۳)

جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطے کہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔

۹- ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انہوں نے اس کو منع کیا، اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔(۱)

۱۰- خانۂ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک بڈھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے، کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا(۲) اسی طرح عورتیں خانۂ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں، آپ ﷺ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ ”خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہئے“(۳)۔ اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس

---

(۱) بخاری جلد ۱ ص ۵۴۱ باب بنیان الکعبة باب ایام الجاهلیة ۔(۲) ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع ا ص ۲۸۱ ۔(۳) ایضاً ص ۲۸۰۔

خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔(۱)

۱۱- انصار حج کر کے واپس آتے تھے، تو دروازہ کی راہ سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے، اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا، اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت و ملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:(۲)

لَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا (بقرہ:۲-۱۸۹)	گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی صرف اسی کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازوں کی راہ سے آؤ۔

۱۲- بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہ گار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈال لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوادی۔(۳) اسی طرح آپ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے، اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ ﷺ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔(۴) ایک بار آپ ﷺ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جُڑے ہوئے ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانۂ کعبہ کا حج کریں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کرو، یہ نذر نہیں ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔(۵)

۱۳- اہلِ عرب ایامِ حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آجائیں اور اُن کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں، اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص ایامِ حج میں عمرہ کیا، اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔(۶)

(۱) بخاری ج ۱ ص ۲۲۹، کتاب الحج باب رکوب البدن (۲) ایضاً باب قول اللہ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ص ۲۴۲ (۳) نسائی کتاب الحج ص ۴۶۱ باب الکلام فی الطواف ج ۲ ص ۲۸ دار الکتاب دیو بند (۴) بخاری کتاب الحجاب الکلام فی الطواف ج ۱ ص ۲۱۹ (۵) فتح الباری ج ۳ ص ۳۸۶ (۶) صحیح بخاری ج ۱، باب ایام الجاهلیة ص ۵۴۰۔

۱۴- جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے، اور اس کو طریقۂ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لئے آتے تھے، وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے، اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے، اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے، اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے، جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا، اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار، حج کے تقدس وحرمت کے خلاف نہیں، اس لئے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں، فرمایا: (۱)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ:۲-۱۹۸)	تمہارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں) فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

۱۵- صفا ومروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے، انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے، جو مشلّل میں قائم کیا گیا تھا، اور طواف نہیں کرتے تھے، اُن کے علاوہ تمام عرب صفا ومروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانۂ کعبہ کے طواف کا حکم دیا، اور صفا ومروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: (۲)

---

(۱) اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب حج میں تجارت کرنا برا جانتے تھے، اس لئے یہ آیت اتری، دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لئے ہو گیا، اس لئے اب اس میں تجارت مناسب نہیں، یہ آیت اسی خیال کی تردید کے لئے اتری، لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے، اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (دیکھو تفسیر طبری الجزء الثانی ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ و اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ)۔ (۲) صحیح بخاری کتاب الحج باب وجوب الصفا والمروۃ ج ا ص ۲۲۳۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا	صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لئے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے۔

(بقرہ:۲-۱۵۷)

حج کے ارکان: اب اس اصلاح وترمیم واضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی، اُن کی تفصیل اور اُن کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں۔

احرام: تمام اعمال اگر چہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہوسکتا، نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے، اس لئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہوجاتی ہیں جو دنیوی عیش ونشاط، زیب وزینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کرسکتا کہ محض کام ودہن کی لذت کے لئے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے، بی بی سے متمتع نہیں ہوسکتا کہ یہ نفسانی وشہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے، سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ وجلال کے اظہار کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر اہلِ عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا، اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ وگدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا، زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لئے باہر رہے، یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تا کہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہر شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہِ عالم وعالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ، بے تکلف اور زیب وزینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف: یعنی خانۂ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے، جس کا ایک ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ۔۲:۲۰۱) خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے، اور آخرت میں نیکی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا“۔

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے، جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''خانۂ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو'' (۱)۔ اور حکم ہوا کہ:

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ. (حج: ۲۲-۲۹) اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔

حجرِ اسود کا استلام: حجر اسود کے لفظی معنی ''کالے پتھر'' کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانۂ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانۂ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب میں بہ گیا اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عہدِ عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہلِ عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے، (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لئے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اُس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا، اور اسی لئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکنِ شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی لے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں، یہ نہ سہی تو اُس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے، مگر ایک مشتاقِ زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے، جس پر ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں، اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ صحابہ کرامؓ، ائمۂ اعلام، اکابرِ اسلام، علمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنہ گار لب اور ہاتھ

---

(۱) ترمذی ابواب الحج باب ج ۱ ص ۱۹۰، نسائی کتاب الحج باب اباحة الكلام في الطواف ج ۲ ص ۳۶۷، دارمی نصف ثانی کتاب المناسک ص ۲۳۳ مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۳ھ و مستدرک حاکم کتاب المناسک باب ان الطواف مثل الصلوة ج ۱ ص ۴۵۹ دائرۃ المعارف حیدر آباد ۱۳۳۴ھ۔

بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے، اور بایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں، اور جیسا کہ حقیقتِ توحید کے ایک عارفِ صادق (۱) نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے، اور نہ نقصان لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا" (۲) الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے، جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے، نہ اشارہ کرے، تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا: صفا و مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں جو گو اب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ اُن کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادیٔ غیب کی آواز سے رُک گئے، اور اسمٰعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام حضرت اسماعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے، تو حضرت ہاجرہ علیہا السلام صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ سعی ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں، جہاں ربّانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہ علیہا السلام کو نظر آئے:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (سورہ بقرہ۔۲:۱۵۸)	بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں، تو جو خانۂ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا پھیرے لگانا گناہ نہیں۔

وقوفِ عرفہ: عرفات میں نویں ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے

(۱) یعنی حضرت عمر بن الخطابؓ۔ (۲) مسلم کتاب الحج باب استحباب تقبیل الحجر ج ۱ ص ۳۸۷ و ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی تقبیل الحجر ج ۱ ص ۴۷ و مستدرک وغیرہ کتاب المناسک باب الحجر الاسود یمین اللہ فتح جلد اول ص ۴۵۷۔

غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے، اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں، یہیں جبلِ رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے، اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماعِ عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمتِ الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیامِ مزدلفہ: حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہِ راست چلے جاتے، تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اس لئے انھوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعرِ حرام کہتے ہیں، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا:

فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٍ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِۖ وَٱذۡكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمۡ وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ. (بقرہ:۲-۱۹۸)	تو جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام کے پاس خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اُس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام: یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں" (۱) رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، اُدھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لئے منتخب کیا، جس کا نام منیٰ ہے، یہاں تمام

(۱) مؤطا امام مالک، باب ماجاء فی النحر فی الحج ص ۱۵۳ مطبع احمدی دہلی۔

حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے، اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بہ جائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بہ جائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یک جہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا:

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (بقرہ:۲-۲۰۳) — خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی: یہ حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائیں:

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ۔ (حج:۲۲-۲۸)

اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے، جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔

یہ قربانی ان لوگوں پر ہے جو حج اور عمرہ بہ صورت قران یا بہ صورت تمتع ادا کریں، اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے:

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ:۲-۱۹۶)

تو جو عمرہ اور حج کا دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے، جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔

حلقِ راس: منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے، (۱) ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا، اُس کے سر کے بال منڈوائے جاتے تھے، یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ (۲) چونکہ

---

(۱) تورات عہد قدیم قاضی اصحاح ۱۳- آیت ۵ گنتی اصحاح ص ۴۰۳، ۶- آیت ۵ ص ۲۱۸ آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔ (۲) ابن سعد جز ثانی قسم اول ص ۳۷ سریۃ المنذر بن عمرو و سیرت ابن ہشام حدیث بیر معونۃ واقعہ عمرو ابن امیہ و جز ناصیۃ و اعتقہ جلد ۲ ص ۱۴۰۔

حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار واعتراف ہے اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی:

مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ (فتح:۴۸-۲۷) اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ (بقرہ:۲-۱۹۶) اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔

رمیِ جمار: منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا، انھوں نے اس کو یہاں رجم کیا، جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں، اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا، اور اسی لئے شیطان کو ''رجیم''، یعنی ''کنکری مارا گیا'' کہتے ہیں، صاحب نظام القرآن (۱) کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا، جس کا ذکر سورۂ فیل کی آیت تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ (۱۰۵:۴) میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی تَرْمِيهِمْ کی سنگ باری کی یادگار ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مظاہرہ پتھر کے بتوں کی صورت میں ہوا ہے، اس لئے پتھر کے ان ستونوں کو کنکری مار کر بُت پرستی کے اس سب سے بڑے مظاہرہ کو سنگ سار کیا جاتا ہے، بہر حال خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بہ ظاہر ایک بے کار کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس پھینکنے سے مقصود اس بہانے سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے (۲) قرآن نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ:۲-۲۰۰) جب سب ارکان ادا کر چکے تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے، ویسے ہی خدا کو یاد کرو، بلکہ اس سے بڑھ کر۔

اسی رمیِ جمار پر مراسمِ حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

---

(۱) مولانا حمید الدین فراہیؒ المتوفی ۱۹۳۰ء۔ (۲) مشکوۃ کتاب المناسک باب رمی جمار الفصل الثانی ج۲ص۳۷ دمشق بحوالہ دارمی و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

ان رسوم کی غایت: اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے تا کہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے، اور ہمارے جذبات واحساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گذارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے تغیر واصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانۂ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے(۱) اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ (حج:۲۲-۲۸)

اور تا کہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں، جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں، اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام **شعائر اللہ** اور **حُرُمات اللہ** یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں، اور ان ہی شعائر اللہ اور حرمات اللہ کی تعظیم وزیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهٖ (حج:۲۲-۳۰)

اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے، تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔

صفا ومروہ کی نسبت ہے:

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (بقرہ:۲-۱۵۸)

بے شک صفا ومروہ خدا کا شعار ہیں۔

اور سورۂ حج میں فرمایا:

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (حج:۲۲-۳۲)

یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے، تو یہ دلوں کی پرہیز گاری سے ہے۔

---

(۱) ترمذی ابواب الحج باب کیف ترمی الجمار جلد اول ص ۱۸۰، نسائی، دارمی کتاب المناسک باب الذکر فی الطواف نصف ثانی ص ۲۳۷ و مستدرک حاکم کتاب المناسک باب قصۃ بناء البیت جلد اول ص ۴۵۹۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب واحترام ہے تا کہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں اُن کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب: حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اُتارنے تک ہر حاجی نیکی وپاک بازی اور امن وسلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لئے جائز نہیں کیوں کہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح وآشتی اور امن وامان ہوتا ہے:

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (بقرہ:۲-۱۹۷)	تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے، تو حج میں نہ شہوت رانی کی باتیں کرنا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور جو بھی نیک کام کرو، اللہ اُس کو جانتا ہے۔
غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (مائدہ:۵-۱)	حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں، اُن کو راستہ میں تکلیف دینا، اُن کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ اس خانۂ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تا کہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے:

وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ:۵-۲)	اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو، جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے، جس کا نام کفارہ ہے، یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًا ۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ (مائدہ:۵-۹۵)	اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو، اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے، مواشی میں سے اس کا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کی جائے، یا اس کے گناہ کا اتار ہے کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے، تا کہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آ جاتا ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں: محمد رسول اللہ ﷺ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے، اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں، بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفۂ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اسمٰعیلؑ کی نذر اور مکہ میں اُن کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کو جامع ہے، آیئے ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

(بقرہ:۲-۱۲۵و۱۲۶)

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع و مرکز اور امن بنایا، اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور کھڑے ہونے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف کرو، اور جب ابراہیم نے کہا، میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

(بقرہ:۲-۱۲۸و۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو اپنا تابع دار بنا، اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرماں بردار گروہ بنا، اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا، اور ہم کو معاف کر، تو بے شک معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے، اے ہمارے پروردگار! اور ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجنا۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ

(حج:۲۲-۲۶ تا ۲۸)

اور جب ہم نے ابراہیم کو گھر کی جگہ ٹھکانہ دیا کہ کسی کو میرا شریک نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے والی اونٹنیوں پر سوار ہو کر دور دراز راستہ سے آئیں گے تا کہ فائدے کی جگہوں میں آ کر جمع ہوں، اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے اُن کو جانور روزی کئے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ. رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَإِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. رَبَّنَآ إِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ.

(ابراہیم:۱۴:۳۵ تا ۳۷)

اور جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار! اس آبادی کو امن والی بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے، ہمارے پروردگار! تا کہ وہ نماز کھڑی رکھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا، وہ اُن کی طرف جھکیں اور اُن کو پھلوں کی روزی دے تا کہ شکر گذار ہوں۔

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے۔

۱- خانۂ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن ومسکن ہے۔

۲- حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا، کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے، اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تا کہ پہلے کی طرح یہ گھر بے نشان نہ ہو جائے، اور آخر اُن میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

۳- یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں، آباد ہوئے ہیں، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں، تو تو اس بے ثمر اور شورزمین میں اُن کی روزی کا سامان کرنا، اور لوگوں کے دلوں کو اُن کی طرف جھکانا کہ وہ اُن سے محبت کریں۔

۴- حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہیں گے تا کہ یہاں آ کر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔

۵- جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں، خداوندا! تو اُن کے گناہ معاف کر تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

۶- خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لئے تمام وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت: خانۂ کعبہ اس دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس میں اُس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اُس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں، اور ایک ہی مقام کو اُمّ القریٰ مان کر، وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملتِ ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی

تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں، اور تھوڑے دن کے لئے عرصۂ حج کی تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباسِ احرام میں، ایک وضع میں، دوش بدوش، ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہیں، اس لئے یہ حرمِ ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خوں ریزی اور ظلم وستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت ووطنیت کی تنگ نائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی کی تجدیدی پکار نے سیکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد وکوشش میں مصروف ہیں مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالم گیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علم بردار ہے، آج دنیا کی قومیں ''ہیگ'' (ہولینڈ) میں اقوامِ عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں، لیکن مسلمان اقوام عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشیں خود احکم الحاکمین ہے، جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، یہ حج کا موسم اُن کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امورِ خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے، اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے، اور طریقِ عمل طے کرتے تھے، اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں، تو اُن کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی، اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائلِ حج کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ. وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ.

(بقرہ:۲-۲۰۴و۲۰۵)

بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اُن کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں، حالاں کہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہیں، اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں کہ اس میں بے امنی برپا ہو اور تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں، اور اللہ فساد پیدا کرنے کو پسند نہیں کرتا۔

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ

(بقرہ:۲-۲۰۸)

اے ایمان والو! تم سب کے سب امن میں ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بہ سال دور دراز اقلیموں، ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا، اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اُس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بہ یک وقت خطاب کیا اور سب نے سمعاً وطاعتاً کہا، آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ اور دوسرے خلفائے زمانہ، صحابہ کرامؓ اور ائمہ اعلامؒ نے اسی طرح سال بہ سال جمع ہو کر احکامِ اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے، اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نو آبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے، وہ سال بہ سال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے، اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیمؑ میں جمع ہو جاتے تھے، اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درس گاہ کے صحن میں ایک دفتر میں

جمع کر دیتے تھے، یہیں آ کر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی سندھی (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا، اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں، اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں، اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا، عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد عبداللہ بن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابو ہریرہؓ کے مستفیدوں سے اور انسؓ کے حلقہ کے فیض یاب علیؓ کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا، جہاں ائمۂ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیض یاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا، جس کی بنا پر صحابۂ کرام اور اُن کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا اور آپ ﷺ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدوّن ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آگئیں اور مؤطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالمِ وجود میں آئے اور ائمۂ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کی کتابیں مدون ہوں اور پھیلیں، ہر ملک اور ہر شہر کے علما دوسرے ملک اور شہر کے علما کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکیں اور زمانہ کے حالات کے زیرِ اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی، اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے تھے، جس سے اُن میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے، یہیں آ کر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا

ہے، زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اُس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو، اس کو خاص ذوق ہوتا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات وواقعات کے لئے بے چین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا، اور خشکی تری سے اُس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفرِ حج نے بہت کچھ مدد کی ہے، مسلمانوں میں بہ کثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گذرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی، یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفرِ حج کو قرار دیا ہے۔

رزقِ ثمرات: اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بسنے والے کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی، کہ ''خداوندا میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب وگیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے، تو لوگوں کے دل اُن کی طرف جھکانا اور اُن کے رزق کا سامان کرنا، اور اُن کو پھل کی روزی دینا، اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لئے زکوٰۃ وخیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی، لیکن یہ اُن لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار ہو جاتے جو اُن کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ اُن کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اُس کو اُن کی روزی کا سامان بنا دیا، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے تھے، بنی اسمٰعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے (تکوین: ۳۷-۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے، جس کا ذکر سورہ ''لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ'' میں ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام ومصر وروم تک جاتے تھے۔(۱)

(۱) تفصیل اور حوالوں کے لئے دیکھو میری تالیف ''ارض القرآن'' جلد دوم باب تجارات العرب قبل الاسلام۔

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ واعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا، اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لئے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا پی سکیں، مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے، تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں، کھانا پینا، مکان، سواری اور دوسرے ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں، اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں، اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہل مکہ کو قوتِ لا یموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت: اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لئے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا ہے، ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں، جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں، اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی، اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے (۱) تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہلِ بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت: حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

وَّارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (بقرہ:۲:۱۲۶)

اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ

---

(۱) یہ تخمینہ میں نے اپنے پہلے سفر حج کے تجربہ کی بنا پر جو ۱۳۴۴ھ - ۱۹۲۶ء میں کیا تھا، لگایا تھا، مگر اس کے چوبیس برس بعد ۱۳۶۸ھ - ۱۹۴۹ء میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے، جانوروں کی قیمت بھی چوگنی نظر آئی، بکری کی قیمت کم سولہ سترہ روپے، دنبہ کی قیمت تیس بتیس روپے، گائے بیل کی قیمت اسی سے سو تک اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی، اب اس تخمینہ کی بنا پر ہر چیز کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے۔ ''س'' ۲۰ محرم ۱۳۷۱ھ۔

پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں، اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت: قرآن پاک کے محاورہ میں ''خدا کا فضل تلاش کرنے'' سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصولِ رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے:

وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ:۵-۲)	اور نہ اُن کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں، اپنے پروردگار کا فضل اور خوش نودی تلاش کرتے ہوئے۔

یعنی ان کے مال واسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بہ ظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے اسلام کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے، فرمایا:

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ. لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ. (بقرہ:۲-۱۹۷و۱۹۸)	اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)۔

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں، درست نہ تھا، کہ اول تو طلبِ رزق ہر حال میں بہ جائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی، ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے، یہ مقام گویا مسلمانوں کے عالم گیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالکِ اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کون سا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے

مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا، یورپ اور امریکہ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے، اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت:۔ سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں، اُن کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی، اور تیسری خالص روحانی ہے، وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں، تاہم اُن کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے، کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے، وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد اور قرآن کا مہبط ہے، اس لئے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازاروں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر اُن کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے، اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے، اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادرِ وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، اور افریقہ اور کنیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا، مرکز ہے، وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن اور مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب اُن کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب و اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت اُن کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں، جو دوسرے ملکوں، قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے

ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہوجانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کردیتے ہیں، اور وہ یہاں آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمۂ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہوجاتے ہیں، بلاشبہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے، جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں، ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامنِ دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ‎ ‎ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آکر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روح ایمانی کو تازہ کرسکیں، قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو ''اُمُّ القریٰ'' یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت: اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے، آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمام تر تعلق ارضِ حرم کے کوہ و صحرا اور در و دیوار سے ہے، یہیں حضرت آدمؑ نے سکونت کی، اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حوا علیہا السلام نے آکر اُن سے ملاقات کی، یہیں نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہاں پناہ لی، حضرت ابراہیمؑ نے یہاں ہجرت کی، حضرت اسماعیلؑ نے یہیں سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہاں ولادت پائی، یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اپنی گدہی چھوڑ کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی چاہی، یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو پیاس کے عالم میں نظر آیا، یہیں وہ خانۂ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انھوں نے خدا کے آگے سر جھکائے، اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام اور عرفات ہیں، جو شعائر اللہ ہیں، یہیں وہ

پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہاں ملتِ ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، یہیں وہ گلیاں اور راستے ہیں جو جبریل امینؑ کے گذرگاہ تھے، یہیں وہ غارِ حرا ہے، جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحنِ حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ترپن سال بسر کئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے، اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ ان ہی مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا:

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ (آل عمران ۳:۹۷) اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں، ابراہیم کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہوجاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہوجاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے، دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہوجاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (حج: ۲۲-۳۲) اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقوی کے سبب سے ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (حج: ۲۲-۳۰) اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔

خالص روحانیت: ''حج کی حقیقت'' میں گذر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں، یہ توجہ کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے، حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں، اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں، ''حج مبرور'' رکھا ہے، یعنی ''وہ حج جو سراپا نیکی ہو'' اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلوں کے لئے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آیندہ کے لئے اطاعت اور

فرماں برداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. (بقرہ:۲-۱۲۸)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرماں بردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرماں بردار گروہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو بندوں کی طرف رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر جہاں اکثر نبیوں اور رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرماں برداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرماں برداری کا عہد واقرار ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولا کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گنہ گاروں کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم وکرم لطف وعنایت کا بحرِ بے کراں ہے۔

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ ''حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے، اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گذارتا ہے، اس کا سورج ڈوبتا ہے، تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔ (۱)

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ''جو انھوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا) موطا امام مالک میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خوش خبری سنائی کہ ''بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل ورسوا اور غضب ناک نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں''، اسی طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور

(۱) نسائی وترمذی وبزار وطبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد کتاب المناسک فضل الحج ووجوبہ تاریخ جلد اول ص ۱۶۳ میرٹھ۔

مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا، اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ''خداوندا میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں'' کا ترانہ دم بدم اُس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، طواف میں، سعی میں، کوہِ صفا پر، کوہِ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں، ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے، اور اس بنا پر کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب له (۱) گناہ سے بہ صدقِ دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے، اس لئے حجِ مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

گوکہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں، اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں، لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں، صدقِ توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں، ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں انبیا علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنہ گاروں کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا وزاری، فریاد وبکا اور آہ ونالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہیں، جہاں حضرت آدمؑ وحوا نے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے دعا کی، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان ہم گنہ گاروں کی دعائے مغفرت کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے اور ''ہنوز آں ابرِ رحمت درفشاں است''

(۱) سنن ابن ماجہ باب ذکر التوبۃ ص ۳۲۳، اصح المطابع دہلی ناشر کتب خانہ رشیدیہ دیوبند۔

انسانوں کی نفسیت (سائکلوجی) یہ ہے اور روزمرّہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حد فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہاں پہنچ کر اُس کی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں، اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں، بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اُن کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں، جہاں سے ادھر یا اُدھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو، اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، اُن بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے، خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگیوں کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آیندہ اطاعت اور فرماں برداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف، خیر سے سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رُخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اُس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی سے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ نے یہ فرمایا:

من حج لله فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته امهٗ (۱)	جس نے خدا کے لئے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس

(۱) سنن ابی داوٗد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے، مثلاً صحیح بخاری کتاب المناسک باب فضل الحج المبرور ج ۱ ص ۲۰۶ وباب قول الله عزوجل فَلَا رَفَثَ الخ ج ۱ ص ۲۴۵ وصحیح مسلم کتاب الحج باب فی فضل الحج والعمرة ويوم عرفة ج ۱ ص ۵۱۸ وسنن ترمذی ابواب الحج باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرة ج ۱ ص ۱۶۷، وسنن نسائی کتاب الحج باب فضل الحج جلد ۲ ص ۲ وسنن ابن ماجہ ابواب المناسک باب فضل الحج والعمرة ص ۲۱۳، یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں۔

دن اس کی ماں نے اس کو جنا۔

یعنی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں، اور جس کی آخری آیتیں، طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں:

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ. وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ. اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ.

(بقرہ:۲-۱۹۹تا۲۰۲)

پھر طواف کے لئے وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلے، اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو بے شک خدا معاف کرنے والا، اور رحم کرنے والا ہے، اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو، یا اُن سے بھی زیادہ تو بعض لوگ (حج کی دعا میں) کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں دے اور ایسوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا، اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:

۱- حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے، جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل وعیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے، اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بہ خود محسوس ہو جاتی ہیں، معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبک دوش ہو جائے، اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

عام طرزِ معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سیکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لئے

رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۲- اسلام آج ہر ملک میں ہے اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے، تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے، جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں، اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالم گیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳- مساوات اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے، جب امیر وغریب، جاہل وعالم، بادشاہ اور رعایا، ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴- بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے خود حلال وحرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی وملی زندگی کے ہر رُخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانوں کی عالم گیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

''جہاد''

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج:۲۲:۷۸)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریروں میں نہیں آتا، مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت، بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادات کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہیں، ان کو اٹھایا جائے۔

''جہاد'' کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، ''جہاد'' کا لفظ ''جہد'' سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی اور اُس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، اُن کی تدبیروں کو رائگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر اُن سے لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ ''جنگ'' کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے، یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے، آپ ﷺ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی

پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا وسزا کے اعتقاد کے بعد اُن کے مطابق عملِ خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ قعود (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے، سورۂ نساء میں ہے:

لَایَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا. (نساء:۴-۹۵)	مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹھے رہیں، اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان ومال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس ''بیٹھنے'' اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، قرآن پاک میں وہ دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں، اس لئے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے، یعنی ''ہر جہاد'' قتال نہیں ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی سورۂ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں، ۱- جہاد بالنفس اور ۲- جہاد بالمال، یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہاں تک کہ اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تبر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو

کامیاب اور سر بلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی وسعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے، اگر یہ دونوں بُت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحّد ہو جائیں، اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جسمانی وروحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی وسعادت کا یہ گُر صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصولِ ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق وزنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علاحدگی، مال ودولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری کوئی چیز بھی اُن کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انھوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے، وہ دنیا کو معلوم ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ. (حجرات-۴۹:۱۵)	مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں، اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔
فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ...... الآیۃ (آل عمران:۳-۱۹۵)	پھر جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے، اور لڑے اور مارے گئے ہیں، ان کے گناہوں کو ان سے اتاروں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔

جہاد کی قسمیں: ا: جب جہاد کے معنی محنت، سعیٔ بلیغ، اور جدوجہد کے ہیں، تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہوسکتا ہے، علمائے دل کی اصطلاح میں ''جہاد'' کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے، اور اسی کا نام اُن کے ہاں ''جہاد اکبر'' ہے، خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپ نے اُن صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے، فرمایا

تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے'' حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں، (۱) چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے'' یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو'' یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید، اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ. (عنکبوت:۲۹-۶۹)	اور جنہوں نے ہمارے بارہ میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے، اور بے شبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے، کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے، اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ. (عنکبوت:۲۹-۶)	اور جو کوئی جہاد کرتا ہے، (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ''ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں، یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کردیں گے اور اس کو اپنی راہ دکھائیں گے'' یہی ''مجاہدہ'' کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورہ حج میں ارشاد ہوا:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَاجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (حج:۲۲-۷۸)	اور محنت کرو اللہ کی راہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے، اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔

---

(۱) بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۸۵ حیدرآباد دکن۔

یہ ''اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد کرنا ہے'' وہی جہاد اکبر ہے، جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ میں عیش وآرام، اہل وعیال اور جان ومال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ المجاهد من جاهد نفسه یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے (۱) صحیح مسلم میں ہے، کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ''تم پہلوان کس کو کہتے ہو'' عرض کیا ''جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں'' فرمایا نہیں پہلوان وہ ہے، جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے (۲) یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

۲- جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر وفساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل ومعرفت اور علم ودانش کی روشنی ہے، تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل وبرہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل:۱۶-۱۲۵)	تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت ودانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔

دین کی یہ تبلیغ ودعوت جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے، اور اسی طریقہ کا نام ''جہاد بالقرآن'' ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد، یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی، اور اسی سے کفار ومنافقین کے شکوک وشبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا:

فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا کَبِیْرًا. (فرقان:۲۵-۵۲)	تو کافروں کا کہنا نہ مان، اور بذریعہ قرآن کے تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

---

(۱) بحوالہ کنز العمال کتاب الایمان جلد اص ۳۸ و ۳۹۔ (۲) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب فضل من يملك نفسه عند الغضب جلد ۲ ص ۳۹۶ مصر۔

بذریعہ قرآن کے جہاد کر، یعنی قرآن کے ذریعہ سے توان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے ''جہاد کبیر'' ''بڑا جہاد'' اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے، اوراس کو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے (۱)۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں ان کو اس لئے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا، یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

۳- جہاد بالمال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے، اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آرام وآسایش کے لئے بھی خرچ کیا جائے، تو اسی کی مرضی کے لئے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیہ پر موقوف ہیں، اس لئے جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جد وجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور ان ہی سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز وشاداب ہوا اور اسی لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ	بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور
وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (انفال:۸-۷۲)	جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ وتاکید کے متعلق بہ کثرت آیتیں ہیں، بلکہ بہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا، جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے:

---

(۱) احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۱۱۹ ۱۳۳۵ھ۔

اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ. (توبہ:۹-۴۱)

ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو، نکلو اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو معلوم ہو۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجَاهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ اُولٰۤـئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ. (حجرات:۴۹-۱۵)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔

فَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ عَلَى الۡقٰعِدِيۡنَ دَرَجَةً (نساء:۴-۹۵)

اپنے مال اور اپنے نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں:

میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لئے آسان ہے۔

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہیں پیش آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے:

گر جان طلبی مضائقہ نیست گر زر طلبی سخن دریں است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے۔

۴- جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے، ارشاد ہوا کہ ”تمہارا جہاد (نیک) حج ہے(۱)“ کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد باب جہاد النساء جلد اول ۴۰۲ و ۴۰۳۔

فرمایا کہ کیا تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی جی ہاں، فرمایاففیھما فجاھد تو تم انہی کی خدمت میں جہاد کرو(۱)۔ یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پرحق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

ان من اعظم الجھاد کلمۃعد ل عند سلطان جائر (۲)	ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔

۵- اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم وجان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے، جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اوراس کی آخری حد خطرات سے بے پرواہوکر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کردینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا، اوراس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے، ایسے جاں نثار اور جان باز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اس کو بخش دی جائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کردی جائے، اسی لئے ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۵۴)	جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔

آل عمران میں ان جاں بازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (آل عمران:۳-۱۶۹و۱۷۰)	جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جارہی ہے، خدا نے ان کو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے، اس پر وہ خوش ہیں اور جو آج تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں، ان کو خوش خبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غم میں ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب بر الوالدین الخ ج ۲ ص ۳۷۶، ایضاًباب الجھاد باذن الابوین ص ۴۲۱، ابوداؤد ج ۱ ص ۳۴۲ کتاب الجہاد باب فی الرجل یغزووابواہ کارھان ۔(۲) جامع ترمذی ابواب الفتن باب افضل الجھاد کلمۃ عدل الخ ج ۲ ص ۴۰۔

ان جاں نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں شہید ہے، یہ عشق ومحبت کی راہ کے شہید زندۂ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گل گوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے(۱)، اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے، وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَآءَ (آل عمران:۳-۱۴۰) اسی کے ساتھ وہ جاں باز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے، لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اس وقت اس لئے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارخانہ ختم نہیں ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسن نیت کے بہ دولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے، اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب وتعظیم کے لئے ''غازی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں:

وَمَنْ یُّقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُقْتَلْ اَوْیَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا. (نساء:۴-۷۴)

اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے، پھر وہ یا مارا جاتا ہے، یا وہ غالب آتا ہے تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ.

(آل عمران:۳-۱۹۵)

تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے، ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے، ان کو جنت میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

ان آیات کی تفسیر وتشریح میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث میں مذکور ہے، جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ

(۱) صحیح مسلم کتاب الجہاد باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ملتی ہے ''لا یکلم احد فی سبیل اللہ واللہ اعلم بمن یکلم فی سبیلہ الا جاء یوم القیامۃ وجرحہ یثعب اللون لون دم والریح ریح مسک''، سنن ابی داؤد میں یہ الفاظ ملتے ہیں ''المیت یبعث فی ثیابہ التی یموت فیھا کتاب الجنائز باب ما یستحب من تطھیر ثیاب المیت ج ۲ ص ۴۴۴۔

روح پیدا کردی، جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے، جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے، اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بے تاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے، جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ ''مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں، اور دوبارہ مجھے زندگی ملے، اور میں اس کو بھی قربان کر دوں، اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کر دوں (۱)'' ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں، بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستے میں میں مارا جاؤں، اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے، اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد: یہ تو وہ جہاد ہے، جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا، اور جس کو آتا بھی ہے، تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے، جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے، اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، رد ظلم، اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون ایک جہاد بن جائے، اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورہ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں، آخری آیت ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (آل عمران: ۳-۲۰۰)	اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو، اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ، اور کام میں لگے رہو، اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہاد محمدی ہے، جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجهاد باب فضل الجهاد والخروج فى سبيل الله ج ۲ ص ۱۲۹۔

عبادات قلبی

یہ اسلام کے ان عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام جو خدا کی رضا کے لئے ہو، عبادت ہے، اس لئے تمام امور خیر خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں، عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرضِ منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیہ نے ان سارے فریضوں کو یک جا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرائض کا بتانا ہے، جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنج گانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لئے ان کا نام ''قلبی عبادات'' رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنج گانہ بھی، جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گو یہاں بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

ہر اچھے کام کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر وشر کی تمیز کے لئے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے، پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض وغایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو، تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ صبر ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کے بہ جائے اس کو خدا کا فضل وکرم سمجھا جائے اور جسم وجان وزبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے، یہ شکر ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلام کے احکام کی غایت ہے: اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ والے ہیں:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. (بقرة:۲-۲) یہ تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (بقرہ:۲-۲۱) اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تقویٰ پاؤ۔

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (بقرہ:۲-۱۸۳) تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

حج کا منشا بھی یہی ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (حج:۲۲-۳۲) اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج:۲۲-۳۷) خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہئے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ (توبہ:۹-۱۰۹) جس نے اپنی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی (توبہ:۹-۱۰۸) البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (بقرہ:۲-۱۹۷) اور سفر میں زاد راہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زاد راہ تقویٰ ہے۔

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (اعراف:۷-۲۶) اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر ہے:

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (بقرۃ:۲-۲۳۷) اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ:۵-۸) انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (آل عمران:۳-۱۸۶) اور اگر صبر کرو اور تقویٰ کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ (بقرہ:۲-۲۲۴) اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا. (نساء:۴-۱۲۸) اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ کرو تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں: آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں ان ہی تقویٰ والوں کا حصہ ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ. (دخان:۴۴-۵۱) بے شبہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ. (طور:۵۲-۱۷) بے شبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ. (ذاریات:۵۱-۱۵) شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ. (قمر:۵۴-۵۴) بلا شبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ. (مرسلات:۷۷-۴۱) بلا شبہ تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ. (ن:۶۸-۳۴) یقیناً تقویٰ والوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا. (نبا:۷۸-۳۱) بے شبہ تقویٰ والوں کے لئے کامیابی ہے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ. (ص:۳۸-۴۹) لاریب تقویٰ والوں کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے۔

کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے: گو بہ ظاہر ابتدا میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بہ ظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہئے، حالاں کہ جو جتنا دور بیں ہے اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دور بیں اور عاقبت اندیش وہ ہیں، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چندروزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح ان ہی کی قسمت میں ہوتی ہے، فرمایا:

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. (اعراف:۷-۱۲۸) اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لئے ہے۔

اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ. (ھود:۱۱-۴۹) بے شبہ انجام کار تقویٰ والوں کے لئے ہے۔

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ. (زخرف:۴۳-۳۵) اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لئے ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى. (طٰہٰ:۲۰-۱۳۲) اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے۔

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں: یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام یا ہر دل عزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دل عزیزی پیدا

ہوتی ہے:

اِنْ اَوْلِیَآؤُہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (انفال:۸-۳۴) تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔

فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ. (آل عمران:۳-۷۶) تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ. (توبہ:۹-۴) اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ. (جاثیہ:۴۵-۱۹) اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔

معیت الٰہی سے سرفراز ہیں: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت ومدد سے سرفراز ہوتے ہیں، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے:

وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ. (بقرۃ:۲-۱۹۴) اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ. اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

(توبہ:۹-۳۶و۱۲۳)

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے: ایک کام ہزاروں اغراض اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیش کش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ. (مائدہ:۵-۲۷) اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔

اسی لئے ان ہی کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دل عزیزی نصیب ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں: یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے، اور دین ودنیا کی تمام نعمتیں اہل تقوی ہی کے لئے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقوی والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورہ زمر میں ہے:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ. لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ. (زمر:۳۹-۳۳و۳۴)

اور جو سچائی لے کر آیا، اور اس کو سچ مانا وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کے لئے ان کے رب کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر

آئے، اور اس ابدی سچائی کو مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت، اور جاہ وعزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بہ ظاہر اس کا نقصان ہو، مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورہ بقرہ میں ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ.
(بقرہ:۲-۱۷۷)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا اور نماز کو برپا کیا، اور زکوٰۃ ادا کی اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ٹھہرے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ بلکہ ایک ایک خط وخال نمایاں کر دیا گیا اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے: تقویٰ اصل میں وَقْوىٰ ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر وشر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ.
(حج:۲۲-۳۲)

اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقوی کا اصلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا)

کے بہ جائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَھُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَھُمۡ لِلتَّقۡوٰی لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ. (حجرات:۴۹-۳)	بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے، ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔

اس آیت میں بھی تقویٰ، کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول ﷺ کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

فَاَلۡھَمَھَا فُجُوۡرَھَا وَتَقۡوٰھَا. (الشمس:۹۱-۸)	تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہ گاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرۃً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہر حال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لئے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا:

اِذۡ جَعَلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الۡحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الۡجَاھِلِیَّۃِ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَعَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَاَلۡزَمَھُمۡ کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی وَکَانُوۡٓا اَحَقَّ بِھَا وَاَھۡلَھَا (فتح:۴۸-۲۶)	اور جب کفار نے اپنے دلوں میں بیچ رکھی، نادانی کی بیچ، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا، اور ان کو تقوی کی بات پر لگا رکھا، اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔

یہاں جنگ وخوں ریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقوی والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ:۹-۴)

توتم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (توبہ:۹-۷)

تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے، اسی طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے، اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ. (محمد:۴۷-۱۷)

جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی، اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا۔

اس سے عیاں ہے کہ ''تقویٰ'' ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہؓ کے مجمع میں ارشاد فرمایا:

اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا (۱)

تقویٰ یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے، کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیوں کی محرک ہے اور وہی مذہب کی جان اور دین داری کی روح ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار: اسلام میں تقوی کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیمِ محمدی ﷺ نے رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب، نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدہا خودساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقوی ہے، اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب تحریم ظلم المسلم وخذله الخ ج۲ ص۳۸۲۔

بلند یہ اعلان کیا:

جَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ

(حجرات: ۴۹-۱۳)

ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت ﷺ نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا ''الکرم التقویٰ'' (۱) یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ ''عرب کو عجم پر، اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے''۔ (۲)

---

(۱) ترمذی کتاب التفسیر سورۃ الحجرات ج ۲ ص ۲۳۲ و مسند احمد ج ۵ ص ۱۰ و مستدرک حاکم کتاب الرقاق باب الحسب المال والکرم التقویٰ ج ۴ ص ۳۲۵۔ (۲) مسند احمد ج ۵ ص ۴۱۱۔

اخلاص

مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ (بیّنہ:۹۸-۵)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں، یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب(۱)	ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے، اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو کہ وہ دل ہے۔

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول ﷺ کو حکم ہوتا ہے:

فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ. اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ (زمر:۳۹-۲و۳)	تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گذاری کو اسی کے لئے، ہشیار کہ اللہ ہی کے لئے ہے خالص اطاعت گذاری۔

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان وزمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض وغایت کو بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا:

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرء لدینہ ج۱ص۱۳ و صحیح مسلم کتاب البیوع باب اخذ الحلال وترک الشبہات ج۱ص۲۳۶۔

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (فرقان: ۲۵-۴۳)

کیا تونے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ. وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ. قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ. قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ. فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ

(زمر: ۳۹-۱۱تا۱۵)

کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی عبادت کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرماں بردار ہوں، کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لئے خالص کر کے، تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔

قرآنِ پاک میں سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ

اطاعت گذاری کو خدا کے لئے خاص کر کے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو، اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (لیل: ۹۲-۲۰) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی مزد اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں:

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

(شعراء: ۲۶-۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰)

نہیں چاہتا، میری مزدوری تو اسی پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔

حضرت نوحؑ کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ

(ہود: ۱۱-۲۹)

اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں، میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔

خود ہمارے رسول ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا، میں تم سے اپنے لئے کوئی مزد و اجرت

نہیں چاہتا، اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لئے:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ. (سبا:۳۴-۴۷)

کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لئے، میری اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے۔

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض اور صرف خدا کے لئے ہے، دوسری جگہ فرمایا:

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ:۴۲-۲۳)

میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا، مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے اس کے لئے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو، اور آپس میں محبت رکھو۔

اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا. (فرقان:۲۵-۵۷)

کہہ دے کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کرلیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بہ ظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے لیکن اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاوا اور نمائش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لئے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزدو اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی ان ہی کو ادا کرتی ہے، جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام ان ہی شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں، اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری

جسمانی اعضا کی حرکت وجنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی جس کا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ ونیت اور کام کی اندرونی غرض وغایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن وقبح اور ضعف وقوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق ومعاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض وغایت سے بالا اور ہر دنیاوی مزد واجرت سے پاک رکھیں، تورات اور قرآن دونوں میں ہابیل اور قابیل آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرمادیا:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ. (مائدہ:۵-۲۷) خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہیں، ان ہی کا کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین ودنیا میں فوز وفلاح بخشا جاتا ہے، ان کو خدا کے یہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر دل عزیزی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں، لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسلٍ فیض یاب ہوتے ہیں اور ان کے لئے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰؑ کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب وغرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا، ان دونوں کے عجائب وغرائب میں ظاہری نہیں باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازی گری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی اور روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لئے یہ فیصلہ ہے کہ:

وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى. (طٰہٰ:۲۰-۶۹) اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰؑ کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بہ خود حل ہوتا جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (آل عمران:۳-۱۵۹)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ خود کردے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے، اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں، اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں، جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل، اسباب وتدابیر سے بے پروائی، اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالاں کہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد وکوشش کا ترک ہی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا، اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جدوجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید فرماتا، اور نہ اس راہ میں جان ومال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر واحد اور خندق وحنین میں سواروں، تیراندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جاجا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک

نقطہ پر ٹھہر جائے، تو اس کے انجام دینے کا عزم کرلو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کردو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران میں ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.

(آل عمران:۳-۱۵۹،۱۶۰)

اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو، پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا، اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کردی کہ توکل بے دست و پائی اور ترکِ عمل کا نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کرسکتا اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش اور مددکارآمد نہیں ہوسکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔

منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا:

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا.

(نساء:۴-۸۱)

تو ان منافقوں سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ، اور اللہ ہے کام بنانے والا۔

آغاز اسلام میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کردو:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ . وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ . وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ . الَّذِيْ يَرٰكَ حِيْنَ تَقُوْمُ. وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ. (شعراء:۲۶-۲۱۴تا۲۱۹)	اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر، اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لئے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے، جب تو (رات کو) اٹھتا ہے، اور نمازیوں میں تیری آمد ورفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گذار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا. (احزاب:۳۳-۱تا۳)	اے پیغمبر خدا سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہنا مان، بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اس کے پیچھے چل، بے شک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام کو بنانے کو کافی ہے۔

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور مصالحت کر لو اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہیں دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ . وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ (انفال:۸-۶۱و۶۲)	اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تو بھی جھک جا، اور خدا پر بھروسہ رکھ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں، کہ تجھے اللہ کافی ہے، اسی نے اپنی نصرت اور مسلمانوں سے تیری تائید کی۔

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف وخطر ہو کر اللہ کے

بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِىٓ إِسْرَآءِيْلَ أَكْثَرَ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ. وَإِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ. فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ.

(نمل:۲۷-۷۶تا۷۸)

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے، جن میں وہ مختلف ہیں اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے، بے شک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بے شک تو کھلے حق پر ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے، کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا:

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا. قُلْ مَآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَآءَ أَنْ يَّتَّخِذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا. وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ

(فرقان:۲۵-۵۶تا۵۸)

اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوش خبری سنانے والا، اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ میں تم سے اس کے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے، اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہیں:

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِىَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.

(توبہ:۹-۱۲۹)

تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہئے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَىْءٍ فَحُكْمُهٗٓ إِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّىْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ.

(شوریٰ:۴۲-۱۰)

اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے، میرا پروردگار، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلی دی جاتی ہے کہ

ان کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو:

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ.

(رعد: ۱۳-۳۰)

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے، جس سے پہلے بہت سی قومیں گذر چکیں، تا کہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں، کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے، کوئی معبود نہیں لیکن وہی، میں نے اس پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہئے:

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.

(الملک: ۶۷-۲۹)

کہہ دے کہ وہی ہے رحم والا، ہم اس پر ایمان لائے، اور اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مخالفتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ ﷺ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبانوں سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوحؑ جب تنِ تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرما دیا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ.

(یونس: ۱۰-۷۱)

(اے پیغمبر) ان کو نوح کا حال سنا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق گذرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کر لیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کر لو، پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اس کو مجھ پر پورا کر لو، اور مجھے مہلت نہ دو۔

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ دشمنوں کے ہر قسم کے مکر وفریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہیں، حضرت ہودؑ کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

اِنِّیْ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ. مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ. اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ (ہود:۱۱-۵۴تا۵۶)	میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو کہ ان سے بے زار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو، پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے، بھروسہ کرلیا ہے۔

حضرت شعیبؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے:

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ. (ہود:۱۱-۸۸)	میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہئے:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ. وَانْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ. وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ (ہود:۱۱-۱۲۱تا۱۲۳)	کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو ہم بھی کرتے ہیں اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ کر۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پیرووں کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز وقریب سب کو چھوڑ کر الگ ہوگئے، اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ

(ممتحنہ:۶۰-۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انہو نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو، ان سے بے زار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کردیا، اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لئے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لئے خدا سے دعا کروں گا، اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار تجھ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت یعقوبؑ اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسفؑ کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں، کہ تم سب شہر کے ایک دروازے سے نہیں بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لئے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ

(یوسف:۱۲-۶۷)

اور (یعقوب نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا، اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا، فیصلہ اللہ ہی کا ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہئے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔

حضرت یعقوبؑ کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شان توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیبؑ کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے تو اس کے جواب میں وہ

پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِي مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ. (اعراف:۷-۸۹)

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آجائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا، اور یہ ہم سے نہیں ہو سکتا، کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کر دے، اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے دل بادل لشکر او رشاہانہ زور وقوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا:

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ. (یونس:۱۰-۸۴)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرماں بردار ہو۔

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا:

عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ. (یونس:۱۰-۸۵)

ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے آزمایش نہ بنا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرمادیا ہے:

مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق:۶۵-۳)

جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔

یہ آیت پاک خانگی ومعاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علاحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟

ع خدا خود میر ساماں است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے

ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے، جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور پرزور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم، اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اونٹ کو یوں ہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں (کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا) یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا، اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو (۱) اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے:

برتوکل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے۔

بعض لوگ تعویذ، گنڈا، غیر شرعی (۲) جھاڑ پھونک، ٹوٹکے، اور منتر پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کردی، اور فرمایا کہ "خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کردئے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور اعتماد رکھتے ہیں" (۳) ایک دوسری حدیث

---

(۱) یہ حدیث بلفظ اعقلها و توکّل، ترمذی (آخر ابواب القیامۃ ص۴۱۴ ابواب صفة القیامة باب ج۲ ص۷۸) اور قیده و توکل، شعب الایمان بیهقی میں اور قیدها و توکل خطیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے۔ (کنز العمال جلد ۲ ص ۲۳ حیدر آباد دکن)۔ (۲) شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام سے تبرک حاصل کرنا ہے لیکن آیات اور دعاؤں کو لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔
(۳) صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق ج۲ ص۸۵۶ و کتاب الرقاق باب وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ج۲ ص۹۵۸ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی دخول طوائف الخ جلد اول ص۱۱۴ جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے۔

میں ارشاد فرمایا کہ "جو دغواتا اور تعویذ گنڈا کراتا ہے، وہ توکل سے محروم ہے۔" (۱) اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے، جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے، تو خدا تم کو ویسے ہی روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے، کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں" (۲) اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیوں کہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں، وہ روزی کے لئے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالاں کہ انہیں اگر یقین ہو کہ:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا (ہود:۱۱-۶)	اور زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں، لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔

تو وہ اس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی، اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دل تنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے، جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا. وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا. (طلاق:۶۵-۲و۳)	اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لئے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بے شک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے، کہ کامیاب افراد وہی

(۱) جامع ترمذی ابواب الطب باب ماجاء فی کراھیۃ الرقیۃ ج ۲ ص ۲۵۔ اصل الفاظ یہ ہیں "من اکتوی واسترقی فھو بری من التوکل"۔ (۲) جامع ترمذی ابواب الزھد ص ۳۸۸ باب ماجاء فی الزھادۃ فی الدنیا جلد ۲ ص ۶۰ و حاکم المستدرک: کتاب الرقاق باب لو انکم توکلتم الخ جلد ۴ ص ۳۱۸۔

ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خوداعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غروراور فریب نفس کے گڈھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خوداعتمادی کے بہ جائے، ''خدا اعتمادی'' کانظریہ پیش کیا ہے، جوان خطروں سے محفوظ ہے۔

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف:۴۶-۳۵)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہے، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی: ''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارنے'' کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضرؑ کہتے ہیں:

اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا . وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا. (کہف:۱۸-۶۷و۶۸)

تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکو گے اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو جس کا علم تمہیں نہیں۔

حضرت موسیٰؑ جواب میں فرماتے ہیں:

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (کہف:۱۸-۶۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود پوری تن دہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں کرتا ہے:

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا (فرقان:۲۵-۴۲)

یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے۔

یہی مفہوم ایک اور آیت میں ہے، کفار آپس میں کہتے ہیں:

اَنِ امۡشُوۡا وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِهَتِکُمۡ (ص:۳۸-۶) کہ چلو اور اپنے خداؤں پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہو)۔

عرب کے بعض گنوار آنحضرت ﷺ کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی سے آپ ﷺ کو پکارتے تھے، ان سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡهِمۡ لَکَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ (حجرات:۴۹-۵) (اور اگر وہ ذرا صبر (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، بایں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقتِ مناسب کا انتظار کرنا: پہلا مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ ﷺ کی مخالفت میں سرگرمِ جولاں ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ ﷺ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ ﷺ کا نگہ بان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا:

وَ اصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا (طور:۵۲-۴۸) (اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیوں کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

فَاصۡبِرُوۡا حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰهُ بَیۡنَنَا (اعراف:۷-۸۷) تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو، یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔

وَاصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ وَہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ. (یونس:۱۰-۱۰۹) اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ یہاں تک کہ خدا فیصلہ کردے، وہ سب سے فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ الۡعَاقِبَۃَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ. (ہود:۱۱-۴۹) ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے۔

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بے چارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو، اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے:

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ (روم۳۰:۶۰، مومن۴۰:۵۵و۷۷) ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ، بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ:

فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا تُطِعۡ مِنۡھُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا. (دھر:۷۶-۲۴) اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ، اور ان (مخالفین میں) سے کسی گنہ گار یا کافر کا کہنا مان لے۔

آنحضرت ﷺ کو حضرت یونسؑ کا قصہ سنایا گیا، کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالاں کہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اس لئے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا سر رشتہ نہ چھوٹنے پائے:

فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ (ن:۶۸-۴۸) اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کر، اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔

بے قرار نہ ہونا: صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو، بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی ہے:

وَالصّٰبِرِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَھُمۡ (حج:۲۲-۳۵) اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

حضرت یعقوبؑ بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسفؑ کو کھالیا، فرماتے ہیں:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ. (یوسف:۱۲-۱۸)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑلی ہے، تو بہتر صبر ہے، اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو۔

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِىْ بِهِمْ جَمِيْعًا (یوسف:۱۲-۸۳)

بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑلیا ہے، تو بہتر صبر ہے، عن قریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت ایوبؑ نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ. (ص:۳۸-۴۴)

ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا۔

حضرت اسماعیلؑ اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِىْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ. (صٰفّٰت:۳۷-۱۰۲)

اے باپ جو کچھ تجھے کہا جاتا ہے وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا: صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیف پہنچائیں، اور مخالفین جو طعن و طنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے، اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بہ جائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، اور کامیاب ہوئے، آنحضرت ﷺ کو اسی لئے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ ﷺ کو باخبر کر دیا گیا:

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ...... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ. (مدثر:۷۴-۱و۲و۷)

اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر،......اور اپنے پروردگار کے لئے پامردی (صبر) کر۔

اس قسم کے مواقع اکثر انبیا علیہم السلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (احقاف:۴۶-۳۵)

(اے محمد) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں نے کی اور ان (مخالفوں) کے لئے جلدی نہ کر۔

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ. (لقمان:۳۱-۱۷)

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بے کسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو اپنے دل دوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروانہ کر اور نہ ان سے دل کو اداس کر بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا:

اِصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ (ص:۳۸-۱۷)

ان کے کہے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے:

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ...... الآية (طٰہٰ:۲۰-۱۳۰ و ق:۵۰-۳۹)

تو ان کے کہے پر صبر کر اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن و طنز کا دھیان نہ دیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں ان سے لطف و مروت برتا جائے، فرمایا:

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا. (مزمل:۷۳-۱۰)

ان کے کہے پر صبر کر اور ان سے خوب صورتی سے الگ ہو جا۔

درگذر کرنا: صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے، یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی

دکھائی جائے، قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ. وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ. (نحل:۱۶-۱۲۶و۱۲۷)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی، اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے، اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ کر، اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لئے ہو:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ. (رعد:۱۳-۲۲)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لئے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت کا انجام ہے۔

فرشتے ان کو مبارک باد دیں گے، اور کہیں گے:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (رعد:۱۳-۲۴)

تم پر سلامتی ہو کیوں کہ تم نے صبر کیا تھا تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے کہ اس آیت کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیوں کہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جوہر ہوگا، وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا اور دشمنوں کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کردی گئی ہے کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی، جس میں صبر ہوگا:

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ

بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یک بارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے

كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ. وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ. (فصلت:۴۱-۳۴و۳۵)

وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا اور یہ بات اسی کو ملتی ہے، جو صبر کرتے ہیں اور یہ اس کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔

جولوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہوگا اس لئے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے، اور معاف کردے، فرمایا:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (شوریٰ:۴۲-۴۲و۴۳)

راستہ ان ہی پر ہے، جولوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لئے پر درد عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت کیا، اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

ثابت قدمی: صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (بقرۃ:۲-۱۷۷)

اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی دکھانے والے) مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں جو سچ بولے، اور وہی پرہیز گار ہیں۔

اگر لڑائی آپڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد و موافقت، اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (انفال:۸-۴۵و۴۶)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو، اور اللہ کو بہت یاد کرو، تا کہ فلاح پاؤ اور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر دکھاؤ، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلتِ تعداد کی تلافی اسی صبر وثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جاں نثاروں کو سکھا دیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (انفال:۸-۶۵و۶۶)	اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار، اگر یہ بیس صبر والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے، اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے، کیوں کہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی، اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، تو اگر سو صبر والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے، اور اگر ہزار (صبر کرنے والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروانہ کریں اور صبر وثبات کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. (بقرۃ:۲-۲۴۹و۲۵۰)	طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آئے ہیں، اور خدا صبر وثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے، اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے تو بولے، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بہا اور ہم کو ثابت قدمی بخش، اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر۔

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا ہے کہ خدا ان ہی کا ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا (نحل:۱۶-۱۱۰)	پھر تیرا پروردگار ان کے لئے ہے جنہوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت وحکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔ (اعراف:۷-۱۲۸)	موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو، اور صبر و استقامت سے کام لو، بےشک زمین خدا کی ہے، وہ جس کو چاہتا ہے، اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے، اور انجام پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہوگئیں اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ۝ (اعراف:۷-۱۳۷)	اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس سرزمین کے پورب پچھم کی وراثت بخشی، جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے، اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی، اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کردیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لئے سربلند ہوئی کہ اس نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ.

(سجدہ: ۳۲-۲۴)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے صبر کیا، اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بہ شدت یقین اور پھر ان اصول کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر راہ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن وملال کے ازالہ کے لئے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد ان کو سناتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ. وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

(آل عمران: ۳-۱۴۶ و ۱۴۷)

اور کتنے پیغمبر ہیں، جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے، اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے ان توبرتو پردوں کو چاک کر دیا ہے، جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرے پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگذر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات

اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے، اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے، معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتح یابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے، ان ہی کے حصہ میں ہے جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی، اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی، حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ. (آل عمران:۳-۱۴۲)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں، اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبط نفس: اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، مگر یہی ضبط نفس کا اصل موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ. وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا

لَفَرِحٌ فَخُورٌ . اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ.

(ہود:۱۱-۹تا۱۱)

مزہ چکھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے، لیکن وہ جنہوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا، اور اچھے کام کئے، یہ لوگ ہیں جن کے لئے معافی اور بڑا انعام ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا: ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے بڑھ کر ایک معنی کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرماں برداری اور عبودیت پر ثبات، نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لئے حکم ہوا:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ......

(مریم:۱۹-۶۵)

آسمانوں کا پروردگار، اور زمین کا اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے، سب کا، تو اس کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)۔

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا

(طٰہٰ:۲۰-۱۳۲)

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اس پر قائم رہ۔

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو خوش خبری سناتا ہے:

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِکَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا. وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا.

(دہر:۷۶-۱۱تا۱۲)

تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچالیا، اور ان کو تر و تازگی و شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔

وہ لوگ جو بارگاہ خدا میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں

شریک نہ ہوں، بے ہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں، اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا ان کو بہشت کا جھروکا بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔ (فرقان:۲۵-۷۵)

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے، کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلاف طبع اور تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، ایوان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام وراحت جان کر جھیل لینا، سود کی دولت سے ہاتھ اٹھالینا، حسن وجمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائیداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لئے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیات پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

حجبت (حفت) الجنۃ بالمکارہ و حجبت (حفت) النار بالشھوات (۱) جنت ناخوشی کے کاموں، اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے، اور گناہوں کے وہ احکام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا میں بڑے پرلطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں، اس عارضی وہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا، بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانۂ مال ودولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے، اور اس وقت بھی مال حرام کی کثرت کے لالچ کے بہ جائے مال حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جو قارون تھا، اس کے مال ودولت کو دیکھ کر بہت سے

(۱) صحیح بخاری کتاب الرقاق باب حجبت النار بالشھوات ج۲ص۹۶۰ومسند احمد ج۲ص۳۳۳و۳۷۳۔

ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے، لیکن جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا، ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نکوکاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ. وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ.

(قصص: ۲۸-۷۹ و ۸۰)

جو لوگ حیات دنیاوی کے خواہاں تھے، وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا، انہوں نے کہا تمہارا برا ہے، اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان لاتا اور نیک کام کئے، سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے ہیں جو صابر ہیں۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیوں کہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

(نحل: ۱۶-۹۶)

جو تمہارے پاس ہے وہ چک جائے گا، اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے، اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا، ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے، اس کے بعد:

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ.

(ہود: ۱۱-۱۱۵)

اور صبر کر کہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

صبر کے فضائل اور انعامات: یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ.

(زمر: ۳۹-۱۰)

صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔

جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں، اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔ (احزاب:۳۳-۳۵)

اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لئے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی نیکیوں کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں، اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۔

(آل عمران:۳-۱۶ و۱۷)

(جنت اور خدا کی خوش نودی ان کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے، ہمارے گناہوں کو معاف کر، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے، اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گنائے ہیں، جن میں پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا، تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا، اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتحِ مشکلات کی کنجی صبر اور دعا: بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت

ﷺ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آتیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر، ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرۃ:۲-۴۵)

اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا، اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لئے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ. اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ.

(بقرۃ:۲-۱۵۳ تا ۱۵۷)

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو، بے شک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے، اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوش خبری سنادو، جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے، تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے، یہ لوگ ہیں، ان پر ان کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیوں کر زندہ رہنا چاہئے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر، ضبط نفس، اور ثابت قدمی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی، اس لئے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہئے، اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ حیات جاوید کی بشارت ہی ہے۔

شکر

وَکُنۡ مِّنَ الشّٰکِرِیۡنَ (اعراف: ۷-۱۴۴)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ "جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے" اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدرشناسی تین طریقوں سے ہوسکتی ہے، دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے، یعنی دل میں اس کی قدرشناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے، خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں، اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں "کفران نعمت" کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کے لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرماں برداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں:

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ○ (دھر:۷۶-۳)

ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا، (اب وہ) یا شکر گزار (شاکر) ہے، یا ناشکر گزار (کافر)۔

لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ. (ابراھیم:۱۴-۷)

اگر تم نے شکر کیا، تو ہم تمہیں بڑھائیں گے، اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرماں برداری کی جائے، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے:

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ. شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبَٰهُ وَهَدَٰهُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ. (نحل:۱۶-۱۲۰و۱۲۱)

دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرماں بردار، اس کو ایک ماننے والا تھا، اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا، اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گذار، اللہ نے اس کو چن لیا، اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے، احکام الٰہی کی پیروی کی جائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا، اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا. (نساء:۴-۱۴۷)

اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے، وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ

پہنچاتا ہے، تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقت ور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے، تو یہ بھی قوت وطاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیل ہیں، اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا:

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (اعراف:۷-۱۷) اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ. (آل عمران:۳-۱۴۵) اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے:

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ. بلکہ اللہ کی بندگی کرو اور شکر گذاروں میں سے ہو۔

(زمر:۳۹-۶۶)

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے، جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لئے یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (فاتحہ:۱-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ بہ رنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں، سب کی پرورش اور زندگی اور بقا، اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں، اور نکھر رہے ہیں، اسی لئے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا، یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ، دوزخ میں جا چکیں گے، وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی، جس کے لئے خدا نے اس کو بنایا تھا، اس وقت عالم امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی:

وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (زمر:۳۹-۷۵) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اسی کی حمد آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے۔

(روم:۳۰-۱۸)

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ جو عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے چاروں طرف ہیں،

بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (مومن:۴۰-۷) وہ اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

(بنی اسرائیل:۱۷-۴۴)

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (مومن:۴۰-۵۵، طور:۵۲-۴۸) اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے دعائیں ہیں، مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ، ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ان کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعمیل میں لگا رکھیں اور ان سے ان کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہیں، مثلاً جو اپاہج اور معذور ہوں، بیمار ہوں کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بے کار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں ان کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا. وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْاَرَادَ شُکُوْرًا

(فرقان:۲۵-۶۱و۶۲)

بڑی برکت اس کی ہے، جس نے آسمان میں برج بنائے، اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا، اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے۔

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں، اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لئے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے:

......الرَّحِیْمُ. الَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ. ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ.

(سجدہ:۳۲-۷تا۹)

......بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. (نحل:۱۶-۷۸)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم شکر کرو۔

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے، اور پھر ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے:

فَکُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰهَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ.

(حج:۲۲-۳۶)

تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ، اور کچھ ان کو کھلاؤ، جو صبر سے بیٹھا ہے، یا محتاجی سے بے قرار ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دئے ہیں تا کہ تم شکر کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِلّٰهِ (بقرۃ:۲-۱۷۲)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی، پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔

فَكُلُوۡا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِيَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ.

(نحل:۱۶-۱۱۴)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی رکھیں، ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا، اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے:

وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ (قصص:۲۸-۷۷)

اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرضہ دے، خدا کو قرضہ دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا

(بقرۃ:۲-۲۴۵ وحدید:۵۷-۱۱)

کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔

وَاَقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا

(حدید:۵۷-۱۸، مزمل:۷۳-۲۰)

اور خدا کو قرض حسنہ دو۔

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا (تغابن:۶۴-۱۷)

اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے:

”حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار، تو تو جہان کا

پروردگار ہے، میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا، کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا، اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا رب ہے، میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار! تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے، میں تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائے گا، میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس (۱) پاتا"۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیوں کر اتارنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے، کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالاں کہ ان کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی، جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا، اور جو کچھ ملے گا، وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی، انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، دیکھ کر، اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں، مگر خوب سمجھنا چاہئے، کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے، اور بارآور بنائے۔

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے، اور جو اس کو ملا ہے، وہ اس کا خاندانی حق تھا، یا اس کے ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی، اور ارشاد ہوا:

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فی فضل عیادۃ المریض ج ۲ ص ۳۸۳۔

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ. نِ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ.

(حدید:۵۷-۲۳و۲۴)

(اور تا کہ) جو خدا نے تم کو دیا، اس پر اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا، جو خود کنجوس ہیں، اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں، اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا، (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن وخوبی) سے مالا مال ہے۔

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے۔

خدا نے انسانوں پر جو توبرتو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگا تار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانیں، اس کے مرتبہ کو جانیں، اس کے حق کو مانیں اور اس کی نعمت وبخشش کا مناسب شکر اپنے جان ومال ودل سے ادا کریں:

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(انفال:۸-۲۶)

اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں تا کہ تم شکر کرو۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(نحل:۱۶-۱۴)

اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو، (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور تا کہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور تا کہ شکر کرو۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(حج:۲۲-۳۶)

اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(قصص:۲۸-۷۳)

اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل وکرم کی تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے، اور دل سے اس کے احسان کو مانے لیکن گنہ گار

انسان کا کیا حال ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْفَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ ھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ. (یونس:۱۰-۶۰)	اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کئے، لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں۔
وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَالَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ. (اعراف:۷-۱۰)	اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی، اور اس میں تمہارے لئے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُرمحبت غضب کا اظہار بھی فرمایا:

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ. (عبس:۸۰-۱۷)	مارے جائیو! انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے۔

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا تو مالک کا شکر ادا ہو گیا، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے، شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لئے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں، اور اس کی فرمایشوں کو پورا کرتے رہیں، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کو پے درپے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اِعْمَلُوْٓا آلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (سبا:۳۴-۱۳)	اے داؤد کے گھر والو، شکر ادا کرنے کے لئے نیک عمل کرو۔

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ (نمل:۲۷-۱۹)	اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، شکر کروں، اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں۔

اس دعا میں بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر میں، شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے، میں ان کے لئے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لئے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانۂ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو نئی نئی نعمتیں اور عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لئے فرمایا:

لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ. (ابراھیم: ۱۴-۷)	اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔
كَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ شَكَرَ. (قمر: ۵۴-۳۵)	ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔
وَسَنَجۡزِى الشّٰكِرِيۡنَ. (آل عمران: ۳-۱۴۵)	اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا اور اس کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کرے گا اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا، بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گذاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گذاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا من لایشکر الناس لایشکر اللہ (۱) (یعنی جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا) اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

(۱) ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک ج۲ص۱۷۔

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات میں آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا بیان تھا، جو عبادات کے باب میں آپ ﷺ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو برتو پردے چاک کردئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جز ہے، اس کی حقیقت کتنی واضح کردی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سکھائے اور آپ ﷺ نے وہ انسانوں کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین ودنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے، اور آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے، اور ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، عملاً صاف، واضح اور متعین ہے اور زمانۂ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے اور اس کا اس طرح ہونا اس لئے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اس لئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح وتوضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت ورسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا، جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہوسکتا۔

صلوات اللہ علیہ وبرکاتہ

مغفرت کا طلب گار

سید سلیمان ندوی

۱۲ر جمادی الثانی ۱۳۵۴ھ ہجری

اشاریہ وکتابیات

حصہ پنجم

مرتبہ

کلیم صفات اصلاحی

رفیق دارالمصنّفین

اشاریہ

اشخاص

کتب

مقامات

☆